بابل کا مینار
اختر آزاد

بابِل کا مینار

(افسانوی مجموعہ)

اختر آزاد

ناشر

بزم ہم قلم

H-3، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نام کتاب : بابل کا مینار

افسانہ نگار کا نام : اختر آزاد

مرتب : منظر کلیم

سن اشاعت : ۲۰۰۰ء

تعداد : ۵۰۰ (پانچ سو)

قیمت : Rs 140/-

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج، دہلی ۱۱۰۰۰۲

ناشر : بزم قلم، H-3، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی ۔ ۲۵

سرورق : اروند کمار

کمپوزنگ : ذہین کمپیوٹر، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی ۔ فون: 6317124

مصنف کے پتے :

(۱) مکان نمبر ۳۸، روڈ نمبر ۱، آزاد نگر، جمشید پور ۔ ۸۳۲۱۱۰ (بہار)

(۲) شعبہ اردو، جواہر نواودیہ ودیالیہ، جوگنا، لوہردگا ۸۳۵۳۰۲ (بہار)

کتاب ملنے کے پتے :

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، بمبئی، علی گڑھ

۲۔ بک ایمپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

۳۔ انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، راؤز ایوینیو، نئی دہلی

۴۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، دہلی ۔ ۶

۵۔ آزاد کتاب گھر، ساکچی، جمشید پور

۶۔ تنویر کتب کونا، سی ایس کالونی، آزاد نگر، جمشید پور

انتساب

والد محترم محمد حسین

اور

والدہ محترمہ نجم النساء

کے نام

جن کی شفقتوں اور دعاؤں کے طفیل

میرے قلم کو جنبش عطا ہوئی

اور میں اختر علی سے اختر آزاد بنا

فہرست

ایک نئے پڑاؤ کی کہانی

قلم کا مزدور اگر اسی طرح مزدوری کرے گا، تو کاغذی نگر میں ایک نیا ''پڑاؤ'' بنے گا۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۸۵ء میں کیا۔ پندرہ سالہ ادبی سفر میں، میں نے افسانے کے بے شمار ''پڑاؤ'' دیکھے۔ لیکن کہیں رکا نہیں۔ رکا بھی ہوں تو دو پل کے لئے۔ اس کے بعد آگے بڑھ گیا ہوں۔ رکنا اور آگے بڑھنا ہی آج میرے افسانے کا مقدر ہے۔ کہیں بھی میرے ادبی ذہن کو سکون میسر نہیں ہو پایا۔ کسی بھی پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ کی طرف بڑھتا ہوں تو آج کا افسانہ میرے سامنے سراپا سوال بن جاتا ہے۔ ''تم کون ہو۔؟ تم مجھے کس روپ میں دیکھنا چاہتے ہو۔؟ اور کیوں دیکھنا چاہتے ہو۔''؟ جواب کے لئے میں ادھر اُدھر نظریں گھماتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ بہت سارے افسانے میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے مجھے پکڑ کر واپس ''پڑاؤ'' میں لے جاتے ہیں۔ پڑاؤ میری حالت زار پر پہلے قہقہہ لگاتا ہے۔ پھر مسکراتے ہوئے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ ''اختر آزاد! تم افسانوی دنیا میں ابھی نووارد ہو۔ اس لئے کہیں رکتے نہیں۔ جس دن تھک جاؤ گے اس دن تم بھی کسی ''پڑاؤ'' میں رکنا چاہو گے، تب تمہیں نہ کوئی پہچانے گا اور نہ ہی کوئی تمہیں اپنے ''پڑاؤ'' میں

رکنے کے لئے جگہ دے گا۔ اس لئے وقت کے نباض بنو اور میرے افسانوی بستر پہ اپنے افسانوی جسم کو لٹا کر اپنی آنکھیں موند لو۔ میں تمہاری نیند میں گھل کر تمہاری روح میں اتر جاؤں گا۔ پھر تمہیں میرا یہ "پڑاؤ" اچھا لگے گا۔ لوگ تمہیں پہچاننے لگیں گے۔ تب تم مجھے چھوڑ کر جانا چاہو گے تو تمہارے اندر کا افسانوی انسان تمہیں روک لے گا۔"

میں کہیں رکتا کیوں نہیں۔؟ جب کہ مجھے اپنے مختصر ادبی سفر اور اپنی کم علمی کا بخوبی علم ہے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ کاغذی سڑک پہ افسانوی گاڑی دوڑاتے دوڑاتے اگر زندگی کے یہ سارے پڑاؤ ایک ایک کر کے پیچھے چھوٹ گئے تو پھر میرا کیا ہوگا۔؟ یہی میرا اور میرے افسانے کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس لئے میں اپنے پندرہ افسانوں کے ہمراہ افسانوی سفر کے اپنے اس پہلے "پڑاؤ" میں آپ کے پاس کچھ دیر کے لئے رکنا چاہتا ہوں۔ خود سمجھنے اور اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے۔ یہاں میں آپ کی نظر سے اس "پڑاؤ" کو دیکھوں گا۔ اگر قابل قبول ہو گا تو کچھ دیر کے لئے ٹھہر جاؤں گا۔ ورنہ آگے بڑھ جاؤں گا۔۔ ایک نئے پڑاؤ کی تلاش میں۔!

افسانہ کیا ہے۔؟ میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں۔؟ مجھے افسانے میں کس چیز کی تلاش ہے۔؟ یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ ہاں! جب کبھی معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں، خود سے الجھ جاتا ہوں۔ اور جب بھی الجھتا ہوں۔ میری الجھن "افسانہ" بن جاتی ہے۔ جب تک میں افسانہ لکھ رہا ہوتا ہوں، میرے اندر کوئی دوسرا "نواس" کر رہا ہوتا ہے۔ اس وقت میرا اپنا کچھ بھی میرے پاس نہیں ہوتا۔ دوسرے کا سب کچھ میرا ہو جاتا ہے۔ اور میں دوسرے کا ہو جاتا ہوں۔ دوسرے کی زندگی جینا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے، یہ تو وہی بتا سکتا ہے جس نے دوہری زندگی کا دوہرا کرب جھیلا ہے۔ لیکن اس تخلیقی کرب میں بھی تخلیق کار ہر پل ایک انجانی طرب سے ہم کنار ہوتا ہے۔ میں خوش قسمت ہوں اس معنیٰ میں کہ میں نے ایک ایسے دور میں لکھنا شروع کیا۔ جب جدید، علامتی اور بے پلاٹ افسانے، بیانیہ کے آئینے میں اپنا چہرہ سنوارنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔

"پڑاؤ" سے مڑ کر جب پیچھے اپنے گھر کی طرف نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ

میرے والد محمد حسین صاحب جو تین بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے، ان کی عمر ابھی صرف دو سال ہی تھی کہ ان کے سر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ میرے دادا اکبر علی بھاگلپور کے شام پور علاقے میں چھوٹے موٹے زمین دار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ خاندان بکھر کر رہ گیا۔ ہوش سنبھالتے ہی والد صاحب جمشید پور چلے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ٹین پلیٹ کمپنی میں فورمین کے عہدے تک پہنچنے کے بعد حال میں ہی ریٹائر ہوئے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پڑھائی لکھائی کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے "الف، ب" بھی نہیں پڑھ سکے۔ لیکن برسر روزگار ہونے کے بعد ایک یتیم اور بے سہارا، دیہاتی ان پڑھ بچے نے ماہانہ ملنے والی تنخواہ کی رسید پہ انگوٹھا لگانا اپنی توہین سمجھا۔ اور پہلی ہی PAY SLIP پہ تھر تھراتے ہاتھوں سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر جس طرح دستخط کیا۔ اس سے ان کی ہمت اور کچھ کر گذرنے کے جذبے کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ دن میں کام کرنا اور رات میں میں پڑوس کے ایک کم عمر لڑکے سے پڑھنا سیکھنا، جیسے ان زندگی کا مقصد ہو کر رہ گیا تھا۔ آج اردو، ہندی اور عربی کے ساتھ ساتھ اپنی ضرورت کے حساب سے تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتے ہیں۔ ان کی محنت، انتھک لگن اور علم سے بے انتہا پیار کا ہی نتیجہ ہے کہ میرے منجھلے بھائی مختار عالم نے الیکٹریکل انجینیر نگ اور چھوٹے بھائی سیف الاسلام نے میکانیکل انجینیر نگ کی۔ میری دونوں بہنوں میں رشیدہ بیگم کو جہاں بی۔ اے تک پہنچایا وہیں سب سے چھوٹی بہن خورشیدہ بیگم کی تعلیم جاری ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی شفقت محنت اور لگن کے سہارے اپنے اس بڑے بیٹے کو "اختر علی" سے "اختر آزاد" بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا سنگھرش سے بھرا جیون میرے لئے آج بھی "آئیڈیل ہے، تخلیق کا "محرک" ہے۔

میری ادبی زندگی کو ایک نئی سمت میرے دوست ارمان شباب (جو اس وقت ابرار مجیب ہیں) نے دی۔ انھوں نے میرے ابتدائی افسانوں کو پڑھنے کے بعد میری کافی حوصلہ افزائی کی۔ سید احمد شمیم، جوہر بلیاوی اور ڈاکٹر منظر کاظمی (مرحوم) تعلیم کے مختلف مدارج میں میرے اچھے استاد رہے ہیں۔ ادب سے لگاؤ کے باعث ان کے قریب آنے کا مجھے موقع

ملا۔اور میں نے اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ادب کو ادب کی نگاہ سے دیکھا اور ادب کو ادب سے سمجھا۔

منظر کلیم صاحب نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے میرے افسانوں کا انتخاب کیا۔ پروفیسر ساغر برنی، جناب انور امام اور جناب تنویر اختر رومانی نے اس سلسلے میں مفید مشوروں سے نوازا۔ مہتاب عالم پرویز ڈاکٹر اکبر علی اور اصغر امام اشک نے مسودہ تیار کرنے میں میری مدد کی۔اس مجموعے کی اشاعت ۹۶ء میں ہی متوقع تھی۔ لیکن لاکھ کوشش کے باوجود عملی جامہ نہیں پہنا پایا۔اس کے بعد بھی کئی بار پروگرام بنے اور بگڑے۔اس سال کے وسط میں میرے عزیز دوست اسلم جمشید پوری جب دہلی سے جمشید پور تشریف لائے تو مجھ سے ملنے میرے گھر آئے۔ اور بات چیت کے دوران انھوں نے یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھوں سے مسودہ چھین لیا۔"تم مسودہ تیار کر کے جب چار سال میں ایک مجموعہ شائع نہیں کر اپائے تو پھر اب .... میں اسے اپنے ساتھ دہلی لے جا رہا ہوں۔دو تین ماہ کے اندر تمہارا یہ مجموعہ میری دیکھ ریکھ میں شائع ہو جائے گا۔" اور اس طرح انھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود مسودہ سے کتاب تک کا مرحلہ تنہا طے کر کے دوستی کا حق ادا کر دیا۔

آج وقت کے اس پڑاؤ پر ڈاکٹر منظر کاظمی (مرحوم) کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میرا قلم کانپ رہا ہے۔ منظر کاظمی نہ صرف میرے اکیڈمک استاد تھے بلکہ ادب کی تفہیم میں ان کی رہنمائی ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ میری کتاب پر ان کی تحریر ان کی آخری تحریر ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ افسوس رہے گا کہ کاش وہ موجود ہوتے اور میری کتاب پر اپنی تحریر دیکھ پاتے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے "بابل کا مینار "میرے افسانے کا پہلا "پڑاؤ" ہے۔اور اس پڑاؤ تک پہنچنے کے لئے میں نے حرف حرف جوڑ کر لفظوں کا جو پل بنایا ہے، اور لفظ نما کاغذی اینٹوں کو بالو اور سیمنٹ کی روشنائی سے جوڑ کر افسانوی "پڑاؤ" کی جو تعمیر کی ہے۔اس کا ایک بھی افسانہ اگر آپ کو پسند نہیں آیا، تب بھی قلم کا یہ مزدور، اسی طرح مزدوری کرتا رہے گا۔اور "پڑاؤ" بنتے رہیں گے۔

۲۲ر ستمبر ۲۰۰۰ء

اختر آزاد، جمشید پور

دوڑ

میری آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کے کینوس پر جب مستقبل کی فلک بوس عمارت پاش پاش ہونے لگی، تب میں نے فیصلہ کیا تھا۔

میں بھی زندگی کی دوڑ جیتوں گا۔!

جوانی کی رہگذر بڑی پر خطر ہوتی ہے۔ انسان خود سے خوف زدہ رہتا ہے کہ کوئی غلطی طوفان کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ ایسے وقت میں تنہائی کی خلیج کو پاٹنے اور رہگذر سمیٹنے کے لئے اپنے اندر شریک سفر کی خواہش کون نہیں کرتا۔ جب میرے اندر بھی ایسی ہی خواہش کونپل کونپل چل کر جوان ہوئی تو مالتی ساتھ دینے کے لئے آگے بڑھی۔ پھر تین سال کے بعد دو ننھے منھے بچّے پرکاش اور رما ہماری زندگی میں دبے پاؤں آگئے۔

میں جن راستوں پر چل رہا تھا، وہ مالتی کو پسند نہ تھا۔ قدم قدم پر بکھرے سنگ ریزے اس کے کومل پاؤں کو لہولہان کر رہے تھے۔ اس لئے مالتی جب کبھی سہیلی کے پاس کے گھروں سے لوٹتی۔ اُداس اُداس سی نظر آتی۔ جھنجلا کر باتیں کرتی۔ کبھی یہ کہتی۔ کبھی وہ کہتی۔ وہ ٹھیک ہے اور یہ ٹھک نہیں ہے۔ اس کے یہاں ''وہ'' ہے اور ہمارے یہاں ''وہ'' تو کیا

"یہ" بھی نہیں ہے۔

میرے سمجھانے پر وہ الٹے برس پڑتی____

"تم ٹیچر کی گھٹیا نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ ارے میں تو کہتی ہوں کہ جس پیشے میں انسان گھٹ گھٹ کر زندگی جیتا رہے اسے چھوڑ دینا ہی اچھا ہے۔"

پرکاش اور رما کی پاگلوں جیسی ضد پر جب میں انھیں قیمتی کھلونے لا کر نہیں دے پاتا تو مالتی کے تیور دیکھنے لائق ہوتے۔

"تمہارا باپ تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اب تم دونوں کے لئے لگتا ہے مجھے ہی بازار نکلنا پڑے گا۔"

میری آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کے کینوس پر جب مستقبل کی فلک بوس عمارت پاش پاش ہونے لگی تب میں نے سوچا.....

میں بھی گھر سے نکلوں گا۔

زندگی کی دوڑ جیتنے.......!

زندگی کے سمندر ساحل پر میں خوابوں کی سیپ چن رہا تھا کہ میرے اندر کا میں اپنی حیران آنکھیں لئے میرے سامنے آ گیا۔

"اس پروفیشن میں عزت آسمان کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور تم اسے چھوڑ کر جا رہے ہو۔ ذرا سوچو! تم ایک ریگولر ٹیچر ہو۔ ہزار دو ہزار میں گھر والوں کو روکھی سوکھی ہی سہی عزت کی دو روٹیاں تو کھلا ہی سکتے ہو۔

وہ سمجھانے کے انداز میں کہتا رہا____

"اپنے گھر سے دور سمندر پار تنہائی کے ساحل پر سنہری خوابوں کے جال بننا قبل از وقت سرور بخش ہوتا ہے۔ لیکن مستقبل.....! میرا خواب ہی میرا مستقبل ہے، اور مستقبل میری زندگی......

"یہ تمہارا اٹل فیصلہ ہے__؟

"ہاں۔!"

"تو جاؤ! وہاں ایک سنہری زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن سورج ڈوبنے سے پہلے گھر لوٹ آنا تاکہ وقت کا آئینہ تمہیں پہچان سکے"

جمشید پور سے بمبئی میری دوڑ کی پہلی منزل تلخ تجربات سے بھری پڑی ہے۔ میں تھک گیا تھا۔ میرا وجود لہو لہان ہو چکا تھا۔ میری قوت رفتار جواب دے چکی تھی۔ لیکن میں رکا نہیں۔ سرور باطن کی لہر تھکاوٹ کے احساس سے پرے، مجھے حسین خوابوں کے سنہرے دروازے دکھارہی تھی اور میں نشے میں چور کبھی آہستہ اور کبھی تھم تھم کر بڑھتا ہی جارہا تھا۔

شہر بمبئی کی فلک بوس عمارتوں کو چھوتی ہوئی میری آنکھیں، اور چوڑی، چکنی اور کالی سڑک پہ دوڑتا ہوا میں، دنیا سے بے خبر اپنی ہی دوڑ میں مگن تھا۔

بمبئی سے دوبئی میری دوڑ کی دوسری منزل : جان لیوا اور اکتا دینے والی اس دوڑ میں، میں بار بار تھکتا، اور پھر دوڑتا رہا تھا۔ میں وقت کے دوش پر سوار کئی ملکوں کے سروں کو روندتا ہوا امریکہ پہنچا. واشنگٹن کے بارے میں صرف پڑھا اور سنا تھا۔ دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا۔

زندگی کا طواف کرتے کرتے بالآخر ایک دن احساس کی چنگاری میرے اندر سلگ اٹھی۔ میں بے چین ہو اٹھا۔ اس لئے کہ وقت کا ڈوبتا ہوا سورج مجھے اپنی زندگی کی آخری کہانی سنا رہا تھا اور رات کے قدموں کی چاپ میں اپنی پشت پر صاف سن رہا تھا ____ تھکن سے جسم چور چور تھا۔ میں رکنا چاہتا تھا۔ لیکن اگر میں رک جاتا تو اپنی زندگی کا آخری دن کیسے دیکھ پاتا۔؟

اس لئے میں رکا نہیں، پتھریلی اور کٹیلی سڑکوں پر دوڑتا ہی رہا........

دوڑتے دوڑتے پندرہ سال گذر گئے۔ اور میں دوڑ کے اس طویل مقابلے میں وہاں پہنچ گیا جہاں سے دوڑ کی شروعات کی تھی۔ اس لئے آج میں بہت خوش تھا۔

جمشید پور ائیر پورٹ پر اترتے ہی میری آنکھیں ادھر ادھر جانے انجانے چہروں کی تلاش میں انجان چہروں کی کتابیں پڑھتی رہیں ___ لیکن ایک لمبی دوڑ جیتنے کے بعد میرا استقبال شاندار طریقے سے ہوا۔ اور میں خوشی کے مارے ویٹنگ روم میں گھنٹوں بیٹھا رہا۔

چپ چاپ اور خاموش آنکھیں پھیلائے.......

اس وقت میں خود کو یہ تسلی دے رہا تھا کہ میری اچانک آمد ہی اپنوں کے ایک سر پرائز ہو گی۔ اور جب ٹیکسی رکی تو میری آنکھوں میں آسمان جھک گیا تھا۔ میری ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کی بنی عالی شان عمارت نے مجھے بہت چھوٹا کر دیا تھا۔

کال بیل پر انگلی رکھتے ہی دروازہ کھلا ___ مالتی سامنے کھڑی تھی۔

"آپ کون ہیں۔؟ کس سے کام ہے۔؟

میں حیران تھا ___

"پرکاش یا رما کس سے ملنا ہے۔؛" وہ عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔" وہ دروازہ کی طرف مڑ گئی۔ مڑتے مڑتے رکی۔ پھر بولی ___ "کیا نام ہے آپ کا۔"؟

"مالتی" ___!" میرے پاؤں سے جیسے زمین نکلنے لگی، میرے اندر کی چیخ خود بخود باہر چلی آئی

___ میں ہوں میں ___ تمہارا آکاش ___!

اور وہ اس طرح مان گئی جیسے سامان کی خرید و فروخت میں لوگ اونچے نیچے دام پر سمجھوتہ کر لیتے ہیں.

"پورے پندرہ سال کے بعد آئے ہو، اور اب تو تمہارے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔ جب تم یہاں سے گئے تھے تو بالکل جوان تھے"۔

وہ میرے ہاتھ سے بریف کیس لے کر مجھے راستہ دکھانے لگی تھی ___

ڈرائنگ روم کو مالتی نے کچھ اس ترتیب سے سجا رکھا تھا جیسے در و دیوار کو حسن کی زبان مل گئی ہو۔ بے صوت و بے صدا اگر دعوتِ لمس و نظر دیتی ہوئی۔

مالتی نے ہی بتایا ___

پرکاش اور رما کالج کے بعد کلب میں وقت دیتے ہیں۔ وہ بھی تنہائی کے ساحل پہ موتی چننا پسند نہیں کرتی۔ اسے سمندری لہروں کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل اچھا لگتا ہے۔ وہ

کچھ دیر قبل ہی کلب سے لوٹی تھی۔ فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی نہیں
ن پاتی۔ خط مل گیا تھا۔ لیکن پرکاش اور رمانے یہ کہہ کر بات کا گلا گھونٹ دیا تھا کہ ڈیڈی کوئی
دودھ پیتا بچہ تو نہیں، جو ائیر پورٹ سے آتے آتے کہیں راستے میں کھو جائیں گے۔ اور بھلا
مالتی کیسے آتی۔؟ اس کے کلب میں ایک ضروری میٹنگ تھی۔ .

میں اوراق ماضی میں گم، وقت سے بچوں کے نقوش مانگ رہا تھا کہ نوکرانی چائے
کی ٹرے سنبھالے سامنے آگئی۔ پھر میرے پاس سے گذر کر مالتی کے بالکل قریب پہنچ گئی۔

"میری چائے لے جاؤ۔ میں اس وقت جلدی میں ہوں۔"

قد آدم آئینے کے رو برو یہ کہتی ہوئی مالتی مجھے بہت اچھی لگی تھی کار رکنے اور
گیٹ کھلنے کی ملی جلی آواز نے میری نظر کو دروازے کی طرف موڑ دیا۔ اور مالتی بالوں کو کنگھی
دکھانے کے درمیان بول پڑی۔

"پرکاش آیا ہے۔"

میری موجودگی سے بے خبر پرکاش ایک لڑکی کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔
"ممی! مجھے پانچ ہزار روپے کی ابھی ضرورت ہے۔ میں چاندنی کے ہمراہ کالج کے
انوول ٹور پر کشمیر جارہا ہوں۔ دس پندرہ دنوں میں لوٹ آؤں گا۔

الّو کہیں کا___ یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ جا الماری سے نکال لے۔"

مالتی نے اسے اس انداز میں کہا جیسے اس نے پوچھ کر کوئی گناہ کیا ہو۔

پرکاش نے مسکراتے ہوئے چاندنی کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی آنکھیں کہہ
رہی ہوں۔ دیکھا نا چاندنی! میری ممی اس معاملے میں کتنی اچھی ہیں۔ اور پھر وہ دوسرے
کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرے جسم سے میری روح کوئی چھین
رہا ہے۔ اور تب میں اسے پکڑنے کے لئے لفظوں کی سڑک پر آواز کے سہارے آگے بڑھ
گیا۔

"بیٹا پرکاش___!" میری آواز پر اس کے بڑھتے قدم اس طرح رک گئے جیسے
میں نے بیٹا نہیں بلکہ سڑی گالی دی ہو۔

"آکاش یقین جانو تم کافی بوڑھے ہو چکے ہو۔اس لئے پرکاش۔۔۔۔"

پرکاش کو اپنی تمنا کی بانہوں میں بھینچ کر میں ماضی کی طرف لوٹنے ہی والا تھا۔ پندرہ سال کی پیاسی محبت جو اس کے لئے تھی، لمحات کی پیالی میں بھر کر ابھی اسے پلانے ہی والا تھا کہ پرکاش کی دوست لڑکی بول پڑی۔

"چلو بھئی پرکاش دیر ہو رہی ہے۔دس پندرہ دنوں کے بعد جب لوٹو گے تو خوب جی بھر کر ملنا"۔اور اس طرح پرکاش کی چاندنی ایک باپ کو محرومی کے اندھیروں میں چھوڑ گئی۔

اس وقت میں رو کہاں رہا تھا۔اور اگر روتا تو آنکھ کی کٹوری کے آنسو کون نہیں دیکھتا۔؟اور میں اتنا پاگل بھی کہاں تھا، جو ایک چھوٹی سی بات پر اس لئے رو دیتا کہ ۔۔۔۔۔جس کی تمنا میں پندرہ سال بعد لوٹا تھا۔جس کے لئے سب کچھ کیا تھا۔اُسے جی بھر کر پیار کیوں نہ کر سکا۔؟

ایسے بہت سارے سوالوں نے مل کر میری نظر کو مالتی کی طرف موڑ دیا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے روبرو خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ سجا رہی تھی۔ سنوار رہی تھی۔ حرکات و سکنات میں نئی نویلی دلہن سمٹ آئی تھی۔کوئی بھی ایسے وقت میں اسے دیکھنے کی کوشش کرتا۔میں بھی اسے دیکھتا رہا تھا__ سمندر کی ویسی ہی گہرائی۔ موجوں کی ویسی ہی ہلچل اس کے اندرون میں مجھے نظر آئی۔اور میں خود کو دائرے میں سمٹتا ہوا دیکھنے لگا۔۔۔۔ لیکن اس وقت اس نے یہ کہہ کر میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

"چھوڑو بھی آکاش میرے بال خراب ہو رہے ہیں۔"

سورج ڈوبتا ہے، مگر ڈوبنے کے بعد بھی شفق چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن کمپیوٹر کے اس دور میں کسی کے پاس اگر وقت نہ ہو تو اس میں مالتی کا کیا قصور۔؟

اور جب میں نے یادوں کے البم سے اس لڑکی کو ملایا، جو ابھی ابھی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ قدم بہ قدم ڈرائنگ روم تک آئی تھی، وہ رما ہی تھی۔

مگر وہ میری رماں کہاں تھی۔ جسے میں چھوڑ گیا۔؟

مجھ جیسے بد صورت بوڑھے کو اپنے ڈرائنگ روم میں پا کر رما ہی کیا؟ رما جیسی کسی بھی لڑکی کے چہرے پر ناخوشگواری کی ریت بکھر سکتی ہے۔۔ کچھ کہنے سننے کا میں خواہاں تھا۔ مالتی بھی میرے متعلق شاید کچھ بتانا چاہتی تھی۔ لیکن....... مالتی نے کچھ کہا اور نہ میں ہی بتا سکا کہ کون ہوں۔!

"یہ بوڑھا یہاں کیا کرنے آیا ہے۔؟"

رما نے تلخ لہجے میں پوچھ کر کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ جس کا احساس مالتی کو بھی تھا۔ جو اس کے چہرے کی لکیروں سے صاف عیاں تھا۔

"یہ تمہارے ڈیڈی ہیں بیٹی۔"

"کچھ یاد کرتے ہوئے__ ارے میں تو بھول گئی تھی کہ آج ڈیڈی آنے والے ہیں۔،، رما میرے قریب آگئی تھی۔

"کیسے ہیں ڈیڈی۔؟ کب آئے۔؟"

کیسے اور کب کے جواب کے لئے ابھی ہونٹ تیار بھی نہ ہوئے تھے کہ رما بوائے فرینڈ کے اشارے پر بول پڑی۔

"ڈیڈ! آج کلب میں ڈانس کا شو ہے۔ میں نے بھی حصہ لیا ہے۔ یہ ڈریس جان کو پسند نہیں ہے۔ اس لئے سوچی بدل لوں۔ رات یہی کوئی بارہ ایک تک لوٹ آؤں گی۔"

رما اتنے باریک کپڑوں میں باہر نکلی، جس کے اندر سے لگ بھگ پوری عورت جھانک رہی تھی۔ شرم سے میرا چہرہ جھک گیا۔ لیکن وہ مسکراتی ہوئی، بائی کہہ کر اس لڑکے کے ساتھ باہر چلی گئی۔

رما کے جاتے ہی کمرے میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔ اور میں اس دھواں آلود ماحول میں خود کو آہستہ آہستہ گم ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔ تاریکی سے نکل کر بھاگنے کی کوشش میں، میں کافی دیر تک ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ لیکن....

جب بری طرح تھک گیا تب میں نے سوال کیا۔

"میں کہاں ہوں۔؟"

مالتی چپ رہی تھی__

"کہاں ہوں میں۔؟" میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ بڑھا کر خود کو ڈھونڈنا چاہا۔

مالتی اس بار بھی چپ رہی تھی۔

"کچھ کہتی کیوں نہیں۔؟" اچانک اس کے خوشبودار بوائے کٹ بال میری مُٹھی میں آکر پھڑ پھڑانے لگے تھے۔اور میں چیختا رہا۔

"تم نے میرے خوابوں کے ساتھ بلا تکار کیا ہے..... تم نے پرکاش اور رما کی زندگی کے ساتھ بھی......."

"میں نے۔؟" ایک ہی جھٹکے میں مالتی اپنے بال چھڑا لیتی ہے۔

"ہاں! تم نے__ تم نے__؟"

"ارے آج بھی تمہاری آنکھیں بند ہیں."

آواز کا ایک زوردار وار مالتی مجھ پر کرتی ہے۔

"تم آج بھی وہیں ہو، جہاں تھے۔پندرہ سال میں ماحول نے کتنے رنگ بدلے ہیں، کتنی کروٹیں لی ہیں۔ تمہیں کیا پتا۔؟ دو چار دن کے بعد خود جان جاؤ گے کہ موڈرن دور کی سوسائٹی میں عزّت، شہرت اور اسٹیٹس کیا چیز ہے....؟

تیور بدل کر__"اور مسٹر رہی فرینڈ شپ کی بات تو آج جان لو کہ یہی موڈرن سوسائٹی کی پکار ہے۔"

اور ہاں ! ساتھ گھومنے پھرنے میں رکھا ہی کیا ہے۔؟

"پھر تم جہاں سے آرہے ہو وہاں۔؟"

مالتی کے اس طنز و بھرے سوالوں کا اس وقت میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔اس لئے چپ رہا۔

"چپ کیوں ہو گئے۔؟"

اس کے پتھریلے جملے سے میری روح کا آئینہ چٹخ گیا۔لیکن اس بار اس کے سوال کا میرے پاس پورا جواب تھا۔

تڑاخ ___!

اس وقت میں غصے سے کانپ رہا تھا، اور وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھے جا رہی تھی. پھر وہ مجھ پر جھپٹ پڑی اور میری قمیص کا کالر پکڑ کر چیخنا شروع کر دیا۔

"مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔؟" مالتی کی آنکھیں سرخ اور گول ہو کر باہر نکل گئی تھیں آواز میں طوفان کا شور تھا۔

"آکاش! تم نے بیسویں صدی کی سڑک پر بیسویں صدی کی دوڑ جیتی ہے۔ لیکن تمہارے بچوں کو اکیسویں صدی کی دوڑ میں شامل ہونا ہے۔ سمجھے۔!"

مالتی کی اس بات پر میں بھونچکا رہ گیا۔ کیونکہ جب میں گھر سے باہر نکلا تھا تو سوچا تھا: کہ بھی اپنی صدی سے آگے _ بہت آگے نکلوں گا۔ اور ایسا ہوا بھی۔ لیکن....؟

ٹرن۔ ٹرن۔ ٹرن۔

ہوا کی سڑک پر چل کر آواز ڈرائنگ روم کے زینے پار کر گئی تھی۔ مالتی نے اس آواز پر میری قمیص کا کالر اس طرح چھوڑ دیا جیسے وہ بٹن ٹانک رہی تھی۔ چہرے کا رنگ بھی یکا یک غائب ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ اور وہ کھڑکی کا ریشمی پردہ سرکا کر چہک اٹھی تھی۔

"اوہ! ایس۔ ڈی۔ او صاحب آگئے۔"

ہونٹوں کے پھیلنے اور سکڑنے سے پنکھڑی لب کی لالی پر حرف آگیا تھا۔ اور تڑاخ کے پانچ نشان سے مالتی کے رخسار کی تازگی کہیں کھو گئی تھی۔ اس لئے وہ ڈریسنگ روم کے ٹیبل کے پاس آئینے کے قریب آئی۔ جلدی جلدی رخسار و لب سنوارے۔ منی پرس اٹھایا اور دروازے کی طرف تیزی سے بڑھ گئی۔ یکا یک سوچتی ہوئی رکی، مڑی اور اندر کے دروازے کی طرف جھانکتی ہوئی آواز لگائی۔

"ارملا۔!"

مالتی کی آواز پر نوکرانی اندر کے کمرے سے دوڑی چلی آئی۔

"کیا ہے مالکن۔؟" نوکرانی نے آتے ہی کہا۔

"میں فلم جارہی ہوں۔ گھر کا تم ذرا خیال رکھنا۔ سمجھی۔!"

بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کا کام لیتے ہوئے اس وقت وہ مجھے چڑیل لگ رہی تھی ۔ پھر وہ میری طرف مڑی اور اپنی چمکدار آنکھوں کی گولیاں نچا کر بول پڑی۔ ٹھیک آج کے "مرد" کی طرح جو گھر سے باہر نکلتے وقت بیوی سے یونہی کہہ جاتا ہے

"بھوک لگے تو کھانا کھالینا۔ میرا انتظار مت کرنا۔ رات یہی دس گیارہ تک ..... ارے چھوڑو میرا کوئی ٹھکانا نہیں کب لوٹوں گی۔ سمجھے۔!"

پھر وہ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی، تب میں نے سوچا یہ جب اس دوڑ میں آج اتنے آگے نکل چکے ہیں تو پتا نہیں 'کل کمپیوٹر پر انسان اپنی کس پہچان کے ساتھ ابھرے گا۔؟

تجربات کے اس گھنے جنگل میں جب سوچ کا دائرہ پھیلا تو میری بھیگی آنکھیں کمرے کے کونے میں ٹنگی ہوئی دونالی بندوق سے جا ٹکرائیں۔

آج میں ایک ٹانگ کا بھی ہو کر خوش ہوں۔

☆☆☆

انوکھا شہر

امیر شہر منچ پر کھڑے تھے۔

”بھائیو! اس شہر کے قیام کا مقصد ایک انوکھا شہر بنانا تھا، لیکن آج برسوں بیت گئے ہیں اور غریب آج بھی گلی کوچوں، سڑکوں، میدانوں اور ہمارے محلوں کے سامنے چلتے پھرتے، دوڑتے کودتے، ناچتے گاتے، ہنستے مسکراتے، بھوک سے چلاتے اور کشکول ہلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔“

”بھائیو! اس سے پہلے کہ یہ شہر غلاظت کے ڈھیر میں دب کر قصہ پارینہ بن جائے، ہمیں چاہئے کہ ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے جو غلاظت بڑھانے میں مصروف ہیں۔“

”کیا تم سب ایسا نہیں چاہتے۔؟“

مجمع پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے امیر شہر نے جب لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا تو مجمع بھی چیخ اٹھا۔

”ہم سب بھی ایسا ہی چاہتے ہیں۔“

"تو پھر دیر کس بات کی۔؟اس غلاظت کو شہر بدر کرنے کی فوراً کوئی تدبیر سوچو، ورنہ بھگوان کی طرف سے دیا گیا عذاب ہم سب کی کوکھ میں پلنے لگے گا۔،،

امیر شہر کی ان باتوں کو کچھ نے ڈر سے مان لیا۔ کچھ نے خدا کا درجہ دیا تو دل سے ماننا پڑا۔ پھر ہونا کیا تھا: دوسرے ہی دن سے رینج گارڈن" کے چھوٹے چھوٹے بورڈز کو بڑے سائز میں تبدیل کرنے کا کام زور و شور سے شروع ہو گیا۔ شہر کے چوراہوں پر سنہری حرفوں سے "رینج گارڈن" لکھا گیا۔ پرانے نام "غریب نگر" جو دیواروں پر مختلف رنگوں سے لکھے گئے تھے اس پر تارکول پوت دیا گیا۔ جگہ بہ جگہ لگے ہوئے غریب نگر کے بورڈ کو اکھاڑ پھینکا گیا۔

غریب نگر! سالا یہ بھی کوئی نام ہے۔؟"

ہے نہیں! تھا۔ اب تو یہ رینج گارڈن ہے"

"ہا۔ہا۔ہا۔"

شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ غریبوں نے احتجاج کیا کہ یہ نام ان کے پرکھوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ بدلا نہیں جائے۔ تب کئی ایک کے سر پھٹے۔ کئی کی ٹانگیں ٹوٹیں، اور کئی ایک کو آسمان نگل گیا۔

ایک ہفتہ یہ لڑائی جاری رہی تھی۔ آخر کار وقت کے بدلتے ہوئے تیور کے در پر غریبوں نے اپنا سر، سردار کے کہنے پر رکھ دیا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ بدلتا ہے بدل جائے۔ نام کے بدلنے سے جس طرح انسان نہیں بدلتا، اسی طرح یہ شہر بھی ہم سب کا ہے اور کل بھی رہے گا۔

لیکن جب کل آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے سردار بک چکے ہیں اور سب بڑی بڑی عمارتوں میں دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہیں۔ لوگوں نے روکنا چاہا تو انہیں یہ کہہ کر بہلایا گیا۔ "یہ سب کچھ پگلے! تم سب کے لئے ہی تو کر رہے ہیں۔" بعض احتجاجیوں کو بڑے کاموں سے جوڑ دیا گیا یا پھر ان کے عہدے بڑھا دیئے گئے۔ کچھ ایسے لوگ جن کے پاس طاقت تھی یا پھر ویسے لوگ جو تھوڑی عقل رکھتے تھے، انہیں یا تو خرید لیا گیا یا اچھی نوکری

دے کر اپنا ہم نوا بنا لیا گیا۔ تا کہ بغاوت کا علم ہمیشہ جھکا رہے۔

لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں تھا کہ روز مرہ کی زندگی میں کچھ کام ایسے ہیں جنہیں صرف غریب ہی کر سکتے ہیں۔ اس لئے کچھ غریب مزدوروں کا سہارا لینا ضروری تھا۔ ایسے ہی مزدوروں کے لئے جگہ جگہ دکانیں بنوا کر ان کا محنتانہ دوگنا، تین گنا اور یہاں تک کہ کچھ کا دس گنا کر دیا گیا۔ تا کہ وہ سب بھی جلد سے جلد امیروں کی صف میں کھڑے ہونے کے لائق ہو جائیں۔

اور ایسا ہوا بھی۔!

اور ایسا بھی ہوا کہ: شہر کے وہ چوراہے جہاں مزدور روٹی کے لئے سورج کے ساتھ طلوع ہو جایا کرتے تھے۔ گھروں اور میدانوں میں، سڑکوں اور دکانوں میں اپنے لہو کو دھوپ کی چادر پر سکھا کر شام ڈھلے نیم مردہ حالت میں گھر لوٹا کرتے تھے۔ تب کہیں جا کر گھر میں آگ سلگتی تھی۔ پیٹ کی آگ بجھتی تھی۔

لیکن آج انہی چوراہوں سے انہیں نفرت سی ہو گئی تھی کہ اب کوئی کار ان چوراہوں پر آکر نہیں رکا کرتی تھی۔ پیٹ کی آگ کی خاطر چوراہے بدلے گئے۔ لیکن وہاں بھی ان کے بھائی وہی بھوگ رہے تھے۔ آخر کار زندگی سے لبریز چوراہوں کی تلاش میں کچھ دن اور سرگرداں رہے۔ پھر کچھ ناامید ہو کر ہمیشہ کے لئے دوسرے شہر کا رخ کیا اور اپنے آپ کو وہاں کے چاروں کھونٹ سے باندھ کر "غریب نگر" کو بھولنے کی ناکام کوشش میں جٹ گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ماہانہ اجرت پہ اپنا لہو بیچ رہے تھے۔ ایسے لوگوں پر بھی نئے دور کی نئی نئی غیر ملکی مشینوں نے ہزاروں ہزار مزدوروں کا کام خود کر کے ہزاروں کے ہاتھ قلم کر دیئے۔

ایسے میں مزدوروں کی زندگی ایک کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ مزدور جب ہڑتال کی طرف بڑھے تو اس کے بدلے میں بھوک، افلاس اور چند ایک کو موت کے سوا کچھ نہ ملا۔ کچھ ہی ماہ کے بعد ہڑتال خود بخود ختم ہو گئی کہ زیادہ تر مزدور دوسرے شہروں کی طرف اڑنے کے لئے پر تول رہے تھے۔

امیر شہر کا قہر جاری تھا، اور کچھ سخت دل انسان اڑے ہوئے تھے۔

"ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں۔ یہیں مریں گے۔ "غریب نگر ہمارا ہے"۔

امیر شہر کے حکم پر پہلے شہر کے غریبوں کی ایک لسٹ بنائی گئی۔ اسے تیار کرنے میں شہر کے تمام ذی رتبہ اشخاص نے شمولیت کا شرف حاصل کیا۔ پھر آگے کا کام اس طرح جاری رہا کہ پہلے لوگوں نے اپنے اپنے گھروں سے نوکروں کو نکال باہر کیا۔ کرائے کی گاڑیوں پہ بیٹھنا چھوڑ دیا۔ کچھ کے پاس کار نہیں تھی تو انہوں نے کار خرید لی۔ کچھ کو زبردستی خریدوائی گئی۔ کچھ تیز رفتار سڑک سے ڈرتے تھے، انہیں بیچ سڑک پر اسٹیرنگ تھمایا گیا۔ آرام پسندوں سے زبردستی کام کروایا گیا۔

امیر شہر کے حکم کی خلاف ورزی کرنا موت کو بلانا تھا۔ لیکن عورتیں بھلا کب ماننے والی تھیں۔ احتجاج کرتی رہیں۔ "ہمارے کپڑے کون دھوئے گا۔؟؟ برتن اور گھر کون صاف کرے گا۔؟ بچے کون کھلائے گا۔؟ چولہا کون جلائے گا۔؟ کھانا کون بنائے گا؟ اور یہ کام کون کرے گا؟ اور وہ کام کون کریگا۔؟"

امیر شہر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ ان کے شوہروں پر ٹوٹ پڑے۔ "تم سب ہجڑے ہو۔ اپنی عورتوں کو نہیں سمجھا سکتے؟ اگر خود سے کام نہیں ہوتا تو جاؤ۔ ابھی اور اسی وقت روبورٹ خرید لاؤ۔ کل سے ہمارا ہر کام روبورٹ ہی کیا کریں گے۔"

لیکن عورتوں کا احتجاج جاری تھا......

"نہیں روبورٹ ہر کام نہیں کر سکتا۔؟"

"بے وقوف مت بنو۔ امیر شہر کا حکم ہے۔ اور پھر روبورٹ آج کے انسانوں سے بہتر اور کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کر سکتا ہے۔ ورنہ ......"

پھر گھر گھر روبورٹ چلتے پھرتے اور دوڑتے نظر آنے لگے گھر کے کاموں میں وہ عورتوں کا ہاتھ بٹایا کرتے۔ باہر کا کام بھی وہ دیکھ لیا کرتے۔ لیکن درد کا وہ میٹھا لمحہ جب ان کی شریانوں میں دوڑنے لگتا تو عورتوں کو زندہ انگلیوں کا لمس بہت یاد آتا۔ اس وقت امیر شہر کو عورتیں دل ہی دل میں کوسا کرتیں۔

شہر میں اب بھی کچھ ایسے غریب رہ گئے تھے جو چھوٹی چھوٹی دکانیں چلا رہے تھے۔ پہلے انہیں شہر چھوڑنے کے لئے کہا گیا۔ جب وہ لوگ نہیں مانے تو دھمکی دی گئی۔ کچھ کو مار ڈالا گیا۔ کچھ کی دکانیں جلادی گئیں اور کچھ کے مال کی سپلائی مہاجنوں سے کہہ کر بند کروادی گئی۔ آخر کار بے چارے خون کے آنسو لئے شہر سے باہر چلے گئے۔

اب بھی شہر غریبوں سے خالی نہیں ہوا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اس شہر کی خاک سے بنے تھے۔ خاک میں ہی پلے تھے۔ وہ زندگی کا آخری لہو یہیں نچوڑ دینا چاہتے تھے۔ اس لئے اڑے رہے کہ جب تک سانس ہے یہ شہر ہمارا ہے۔

"کیا کہا، شہر تمہارا ہے۔؟"

"نہیں تیرے باپ کا ہے۔"

"سالے زبان لڑاتا ہے۔"

پھر ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر وہ ڈھنائی کی گئی کہ درد سے انگ انگ چیخ اٹھا۔ کچھ اسی رات بھاگ گئے۔ جو بھاگنے کے لائق نہیں تھے انہیں بسوں میں بھر بھر کر دور دراز کے علاقوں میں چھوڑ آیا گیا۔ جہاں ان کے دوسرے بھائی جھونپڑیاں ڈالے ہوئے تھے۔ کچھ ضدی قسم کے لوگوں پر کئی طرح کے الزام لگا کر انہیں جیل بدر کر دیا گیا۔

امیر شہر منچ پر کھڑے تھے۔

"یہ شہر دنیا کا اب واحد شہر ہے، جہاں ایک بھی غریب نہیں ہے۔ اب اسے دلہن کی طرح سجایا جائے۔"

"ریچ گارڈن" کو دلہن بنانے کا یہ منصوبہ دس سالہ تھا۔ جسے بڑی محنت و مشقت اور جانفشانی کے بعد ترتیب دیا گیا۔ پھر کیا تھا غریبوں کی بستیوں کو بلڈوزر سے روند ڈالا گیا۔ سڑکیں چوڑی کی گئیں۔ اتنی چوڑی کہ کئی ایک گاڑیاں ایک ساتھ آجا سکتی تھیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب خوبصورت پیڑ لگائے گئے۔ نالیوں کا انڈر گراؤنڈ انتظام کیا گیا۔ روشنی کا ایسا نظم کیا گیا کہ صبح اور شام، دن اور رات کا امتیاز ہی جاتا رہا۔ لیمپ پوسٹ پر پینٹنگ کا ایسا نمونہ پیش کیا گیا تھا کہ کائنات وہاں اپنا چہرہ دیکھنے اترتی تھی۔ سڑکوں کے کنارے جگہ بہ جگہ ایسے

پارک بنوائے گئے تھے کہ دیکھنے سے ایسا لگتا تھا جیسے ہر پارک جنت کا کوئی حسین گوشہ ہو۔ گول چکروں میں زندگی کا نیا حسن نظر آتا تھا۔ جہاں نئے طرز کے فوارے لگے ہوئے تھے جو روح کو گداز کرتے تھے۔ عمارتیں ایسی ایسی اور وہ بھی اتنی اونچی اونچی کہ نظر رکھتے ہی پھسل جانے کا ڈر ہوتا اور ان عمارتوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ کون سب سے اچھی ہے۔ وہ اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کسی سے کوئی یہ پوچھے کہ یہ اچھا ہے یا یہ......؟

دس سالہ پلان نے ”ریچ گارڈن“ کو ایسی دلہن بنایا کہ دور دراز والے اس کے حسن کو دیکھنے کے لئے پیسوں پر چل کر آیا کرتے تھے جو نہیں آپاتے، ترس کر رہ جاتے۔ مارکیٹ سے اس کی تصویریں خرید کر ڈرائنگ روم میں سجاتے۔ بچہ بچہ اس کے نام سے واقف تھا۔ ہر بچہ اپنے والدین سے پوچھا کرتا۔ ”ریچ گارڈن“ یہاں سے کتنی دور ہے پاپا۔؟ ہم لوگ اسے دیکھنے کب جائیں گے۔؟“

”ریچ گارڈن“ اپنے نام کی طرح ریچ بھی تھا۔ اس لئے وہاں غریبوں کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن ایک دہائی سے پہلے والے غریب آج بھی موجود تھے جو یہاں کے حالات سے ایڈجسٹ کر گئے تھے یا کر دیئے گئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کا شمار آج کل شہر کے رئیسوں میں ہونے لگا تھا۔

انوکھے شہر کی تیز رفتاری دیکھنے کے لائق تھی۔ یہاں سب کے سب اپنے آپ میں مگن تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اب کوئی ہاتھ پھیلائے ہوئے ان کے پاس نہیں آیا کرتا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی اس انتظار میں دروازہ کھلا رکھتے تھے کہ کوئی آئے گا۔ وہ لوگ اپنے آپ میں اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ ان کی اپنی زندگی کٹ کر رہ گئی تھی لیکن پھر بھی سماج کی کچھ رسمیں ایسی تھیں جس کے تحت کئی گھرانے، کئی علاقے والے اور کئی پیشے والے ایک ساتھ مل بیٹھتے تھے۔ یہاں بھی امیروں کی اس بھیڑ میں ہر کوئی اپنی عزت کا بھوکا ہوتا۔ سب یہی چاہتے تھے کہ لوگ اس سے بات کریں۔ اس کی بات کریں اور اس کی بات سنیں۔ لیکن ایسا ممکن اس لئے نہیں تھا کہ سب کے سب اونچی ایڑیوں کے سہارے قد آور ہو گئے تھے۔

کل جب وہ اپنے گھروں سے نکلا کرتے تھے تو ضرورت مند ہر روز ان کا راستہ روک لیا کرتے تھے۔ دن کے وقت گھروں میں پکڑ لینا اور آدھی رات کو نیند میں خلل ڈالنے کے علاوہ جیسے ان غریبوں نے کچھ سیکھا ہی نہیں تھا۔

"مالک۔ مالک ہمار بیٹوا بیمار بھئیو۔ دوائی کے لئے اور ڈگٹر وا پچاس روپیا مانگت ہے مالک۔ کام کرت تہار چکتا کر دیب مالک۔"

"حجور! ہمری بڑی بٹیا کی اگلے مہوا سدیا ہے حجور۔ ہمرا کے ایک ہجار ایڈھانس چاہئے حجور۔"

"سرکار ہم غریب لوگ ہیں۔ کئی دن سے کام ڈھونڈ رہے ہیں۔ کوئی کام دے دیں۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے گا۔"

لیکن اب ان امیروں کے سامنے نہ کوئی ہاتھ بلند ہے، نہ ہاتھ جوڑے، نہ پیر پکڑے، نہ سر جھکائے اور نہ ہی آنکھوں میں آنسو لئے کھڑا رہتا تھا اور نہ ہی زندگی کے لئے کوئی فریاد ہی کرتا تھا۔ پہلے کی رئیسانہ زندگی یاد آتے ہی وہ سب عش عش کر اٹھتے تھے۔ حالانکہ پہلے کی بہ نسبت آج ان کے پاس کیا نہیں تھا لیکن کوئی نہیں آتا؟ اور جب کبھی کوئی خواب میں ان کے پاؤں سے لپٹ جاتا، روتا اور گڑگڑاتا...... پھر...... جب آنکھ کھلتی تب انہیں افسوس ہوتا کہ کاش ایسا آج میرے ساتھ حقیقت میں ہوا ہوتا۔

انوکھے شہر کا ہر کام پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ لیکن ایک دن جب ایک روبوٹ کا میکانکی عمل خاموش ہوا تب اس دن اس شہر کی زندگی میں یکایک خلفشار پیدا ہو گیا تھا جب تک روبورٹ بنا نہیں تب تک اس گھر کے ہر فرد کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ پھر جب کبھی کوئی کمپیوٹر کام کرنا چھوڑ دیتا تو اس گھر کے سارے لوگوں کی یادداشت ہی کھو جاتی کہ وہاں کے لوگوں کی یادداشت تو فلاپی میں محفوظ تھی۔ کون سا کام کرنا ہے۔؟ کس کو کرنا ہے۔؟ کیسے کرنا ہے۔؟ کہاں کرنا۔؟ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک لوگ ایک دوسرے سے یہ پوچھتے رہ جاتے۔ لیکن کسی کو کوئی کام یاد نہ آتا کہ اب تو ان کے سارے کام کمپیوٹر کیا کرتا تھا جب تک بنتا نہیں تب تک لوگوں پر پاگل پن سوار رہتا۔

ایسی ہی کئی ایک پریشانیوں کو سب مل کر جھیل رہے تھے جسے وقتی طور پر سائنسی دور نے پُر کر دیا تھا۔

لیکن ایک دن ایسا بھی آیا کہ کئی کئی مشینیں ایک ساتھ خراب ہونے لگیں۔ پریشانیاں دن بہ دن بڑھتی رہیں...... ایک عورت جب کئی ایک پریشانیوں کو جھیل نہیں پائی تب اس نے ایک دن اپنے بے حد چاہنے والے شوہر کو اپنی کھردری ہتھیلی دکھا کر روہانسی آواز میں کچھ کہا تھا۔ مرد سے بھی رہا نہیں گیا۔ دوسرے ہی دن وہ شہر سے باہر چلا گیا۔ جب لوٹا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ اسے سکھا کر لایا گیا تھا۔ لاکر پھر سکھایا گیا۔ ''کوئی پوچھے تو یہ کہنا کہ میں تمہارا انکل ہوں۔ پڑھنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔''

اس کے پڑھنے کا انتظام یوں کیا گیا کہ قریب کے اسکول میں دکھاوے کے لئے صرف داخلہ کرادیا گیا۔ جب کام نہیں رہتا تو اسکول بھیج دیا جاتا۔ کام کے دنوں میں وہ گھر پر ہی رہتا۔

ایک دن پڑوس کی ایک عورت جس کی اس گھر کی عورت سے بے حد پٹتی تھی وہ اپنے گھر کے کاموں سے بہت پریشان تھی۔ پریشانی کا رونا روتے ہوئے ایک دن پوچھ بیٹھی۔

''تم سے گھر کا اتنا سارا کام اکیلے کیسے ہو جاتا ہے۔؟''

پوچھنے والی عورت کے کان پر اس عورت نے اپنے مسکراتے ہوئے ہونٹ رکھ دئے۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔؟''

دوسرے ہی دن اس کے یہاں بھی ایک جوان لڑکی، سجی اور سنوری ہوئی نظر آئی۔ آس پاس والوں کے پوچھنے پر یہ بتایا گیا کہ ''یہ میری بہن کی لڑکی ہے اور پڑھنے کے لئے آئی ہے۔

اس طرح ایک عورت سے دوسری عورت۔ دوسری عورت سے تیسری۔ اور تیسری سے چوتھی۔ پانچویں...... اور نہ جانے کتنی عورتوں تک یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔

پھر گھر گھر میں کوئی نہ کوئی نیا چہرہ، نا آشنا چہرہ نظر آنے لگا۔ پہلے پہل لوگ کسی نئے چہرے کو دیکھتے ہی چونک اٹھتے تھے۔ "یہ کون ہے۔؟ کیا کرنے آیا ہے۔؟" جواب دینے والا بھی اس نئے چہرے کے ساتھ کوئی رشتہ جوڑ کر گھبراہٹ میں تیزی سے آگے بڑھ جاتا تھا۔

امیر شہر کے قہر سے سب ڈرتے تھے۔ اس لئے اپنے اپنے نوکروں کو چھپا کر رکھنے لگے۔ کام کے وقت گھر کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا یا پھر کمرے میں اسے ہی بند کر کے کوئی کام دے دیا جاتا۔ جس لباس میں وہ کام کیا کرتا تھا، اس لباس کو کام کے ختم ہوتے ہیں چھپا دیا جاتا۔ یا پھر دھو کر بند کمرے میں پنکھے کے نیچے سوکھنے کے لئے ڈال دیا جاتا۔ اور اگر کام کرتے وقت کسی کے آنے کی آہٹ ہوتی، یا آتا ہوا کبھی کوئی دکھائی پڑ جاتا تو یا تو وہ خود غسل خانے کی طرف دوڑ جاتا یا پھر کوئی اسے ہی کھینچتا ہوا غسل خانے کے دروازے تک لے جاتا اور اندر ڈھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیتا۔

دنیا کا یہ واحد شہر تھا، جہاں نوکروں کی عید ہو گئی تھی۔ یہاں کے مالک ہی ڈرے ڈرے سے اور سہمے سہمے سے رہتے تھے کہ اگر کسی بات پر نوکر خفا ہو گیا تو امیر شہر تک بات پہنچ جائے گی۔ اس لئے جب کبھی کام کرتے وقت ان کے نوکروں سے جیسی بھی بھول چوک ہو جاتی، گھر والے ڈانٹنے، گالیاں دینے اور مارنے کی جگہ تسلی دیا کرتے۔

"ارے اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ کانچ کا برتن ہے۔ گرے گا تو ٹوٹے گا ہی۔"

بھئی کپڑے تو دھوبیوں سے بھی جلا کرتے ہیں۔ اگر دس میں ایک جل ہی گیا تو فرق کیا پڑتا ہے۔ پھر نیا آجائے گا۔"

"پہلے پہل جب لوگ کسی کے یہاں نیا چہرہ دیکھتے تھے تو یوں ہی پوچھ لیا کرتے تھے۔ "یہ کون ہے۔؟ کیا کرنے آیا ہے۔؟" لیکن آہستہ آہستہ جب ہر گھر میں نئے چہرے نظر آنے لگتے تو کون ہے اور کیا کرنے آیا ہے۔؟ پوچھنے کا یہ سلسلہ خود بخود ختم ہونے لگا کہ اب لوگ نئے چہرے کا چہرہ دیکھ کر رشتے کی بات مسکرا مسکرا کر خود ہی بتانے لگے تھے۔

"لگتا ہے یہ آپ کے بھائی یا سالے کا......؟"

"ہاں آپ نے ٹھیک سمجھا۔!" جواب دینے والا بھی مسکرا کر آہستہ سے آگے بڑھ جایا کرتا۔

پھر ایک وقت ایسا آہی گیا جب بے شمار نئے چہرے شہر میں نظر آنے لگے۔ لیکن کوئی اب ان چہروں کو دیکھ کر کچھ کہتا نہیں تھا۔ بس ایک نظر دیکھنے کے بعد مسکرانا اور آگے بڑھ جانا لوگوں کا جیسے ایک میکانیکی عمل ہو گیا تھا۔ اس طرح کچھ کو حالات نے نڈر بنادیا تھا۔ وہ کچھ اس شان سے اپنے نوکروں کو نہلا دھلا کر اور خوبصورت کپڑے پہنا کر اپنے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کے لئے باہر چھوڑ دیتے تھے تاکہ شک نہ ہو۔ اور اگر ایسا ہوا بھی تو کون ......؟

عمر اور حالات کے ساتھ انسان کے خیالات کا بدلنا یقینی ہے۔ امیر شہر میں بھی پہلے والی وہ بات نہیں رہ گئی تھی۔ اب کسی چوراہے پر آکر غریبوں کے خلاف وہ کوئی لمبا چوڑا بھاشن نہیں دیتے تھے۔ کہ ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

"ریچ گارڈن" کے لئے امیر شہر نے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی لیکن بڑھتی عمر کے ساتھ ان کا تندرست و توانا جسم جھولنے لگا تھا۔ اب ان میں وہ پھرتی اور تیزی نہیں رہی تھی۔ لیکن آج بھی ان کی آواز میں وہ جادو تھا کہ خود بخود لوگ ان کے ارد گرد سمٹنے لگتے تھے۔

بھاشن جاری تھا۔

"بھائیو! اس شہر کے قیام کا مقصد کبھی ایک انوکھا شہر بنانا رہا تھا۔ جہاں صرف امیر ہی امیر ہوں۔ ایک بھی غریب......"

اچانک امیر شہر پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دم پھولنے لگا۔ مائک پکڑ کر پہلے وہ کچھ دیر تک کھانستے رہے۔ آخر کار کھانستے کھانستے مائک اسٹینڈ پکڑ کر جھول گئے۔ اس وقت انہیں کوئی پانی لا کر دے رہا تھا تو کوئی کچھ پنکھا جھل رہا تھا تو کوئی کچھ کر رہا تھا تو کوئی کچھ۔ لیکن کھانسی تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس دوران امیر شہر نے اشارے سے اپنے سکریٹری کو بلایا اور کھانستے کھانستے کہا۔

"میرے۔بیٹے۔کو۔جلدی۔بلاؤ۔"

امیر شہر کی اس بات پر سب ہکا بکا رہ گئے۔ اس لئے کہ امیر شہر کے بارے میں کل تک سب یہی جانتے تھے کہ وہ "لاولد" ہیں۔ پھر یکایک "بیٹا" کہاں سے آگیا۔؟

تھوڑی ہی دیر بعد ایک نوجوان مجمع کو چیرتے ہوئے تیزی سے اسٹیج کی طرف بڑھا۔ اسٹیج پر چڑھتے ہی لوگوں نے نوجوان کے چہرے کو ملایا تو وہ چہرہ خود بخود امیر شہر کے سالے سے جاملا۔ تبھی مجمع سے ایک شخص اپنی سیٹ سے مسکراتے ہوئے اٹھا اور بلند آواز میں کہا۔

"لگتا ہے یہ امیر شہر کے سالے کا لڑکا ہے۔؟"

اسٹیج کے بیچوں بیچ لوگ امیر شہر کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی امیر شہر نے لڑکھڑاتے ہو۔ئے اٹھنے کی کوشش کی۔ گرتے گرتے سنبھلے۔ پہلے مسکرائے۔ پھر مسکراتے ہوئے کھانستے کھانستے مائک پکڑ کر جھول گئے۔

"تم سب۔ ٹھیک ہی۔ کہتے ہو۔ یہ میرے۔ سالے کا ہی۔"

یہ کہانی کا دراصل ایک رخ تھا۔

دوسرا رخ کچھ اس طرح ہے کہ "غریب نگر" کے ان لوگوں کو جب "رچ گارڈن" والوں نے بے سہارا اور بے گھر کر دیا تھا، تب وہ لوگ شہر سے قریب سو کیلو میٹر کے فاصلے پر جا کر بس گئے تھے۔

غریبی کی کوکھ سے امیری کا جنم ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسے لوگ جن کا روزگار کا دھندا چل نکلا تھا اور تھوڑا بہت پیسہ ہو گیا تھا۔ ان کی شان و شوکت کا کیا کہنا۔ وہ سب بھی اپنے آپ کو دنیا کے کسی رئیس سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ "رچ گارڈن" کی بڑھتی ہوئی شہرت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے ذہن میں یہ بات سماتی چلی گئی تھی کہ کل جب ان کے ہاتھوں میں وقت آئے گا تو وہ بھی ان لوگوں کو دکھا دیں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب اس علاقے کے دس فیصد لوگوں کے پاس کچھ پیسے ہوئے تو ان لوگوں نے بھی اپنی ایک "ایسوسی ایشن" بنالی اور اس طرح ایسوسی ایشن کے "بائی لاج" کے تحت شہر کی حکمرانی "امیر شہر" کے ہاتھوں میں چلی آئی۔

اور پھر ایک دن امیر شہر منچ پر کھڑے تھے۔

بھاشن جاری تھا۔

"بھائیو! وہ وقت آگیا ہے اور اب ہم یقیناً "ریچ گارڈن" والوں کو منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں کہ آج ہم سب ان لوگوں سے کسی بھی طرح کم نہیں ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کہنے سے نہیں، کرنے سے ہوگا۔ تو اس کے لئے اگر ہم سب آج ہی سے اس شہر کی تعمیر نو میں اپنا تن، من اور دھن لگادیں تو یہ شہر کل یقیناً کسی "ریچ گارڈن" سے کم نہیں ہوگا۔"

اس لئے بھائیو! آج کی رات تم سبھوں کو کیا کرنا ہے۔ یہ تو تم سب اچھی طرح جانتے ہو۔ پھر بھی کہہ دینا بہتر سمجھتا ہوں کہ شہر کے چوراہے پہ لگے ہوئے "غریب نگر" کے بورڈ کو اکھاڑ پھینکا جائے اور اس کی جگہ "یونیک سیٹی" کا بورڈ نصب کردیا جائے۔"

☆☆☆

پاؤں سے جوتے کے درمیان کی دوری

آج پھر میرا بیٹا ہمیشہ کی طرح میرے پاؤں چھو کر گھر سے نکلا ہے۔

پاؤں چھونے کا یہ سلسلہ برسوں سے اسی طرح جاری ہے۔ صبح سویرے سب سے پہلے وہ نہا دھو کر تیار ہوتا ہے۔ شکن آلود کپڑے پہنتے پہنتے وہ اپنی بوڑھی ماں کے ہاتھوں سے گرما گرم چائے لیتا ہے۔ تلوے گھسے ہوئے جوتے کو برش سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتا ہے اور بغل میں فائلیں دبائے مری چال چلتا ہوا وہ میرے پاس سے گذر جانا چاہتا ہے۔ لیکن ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی چارپائی پر اس بوڑھے باپ کو کھانستے ہوئے دیکھ کر وہ رک جاتا ہے۔ نظریں جھکائے میرے پاس آتا ہے۔ پاؤں چھوتا ہے۔ مری ہوئی آواز میں ہر روز یہی کہتا ہے۔

"میں جا رہا ہوں بابو۔"

اور میں ہر روز ایک مشینی انداز میں کھانستے ہوئے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیتا ہوں۔ "بھگوان نے چاہا تو تجھے یہ نوکری......"

اور ہر روز میں صرف اتنا ہی کہہ پاتا ہوں۔ اس وقت میں امید و بیم کے درمیان جھولتا رہتا ہوں کہ نہیں معلوم آج کیا ہونے والا ہے۔ ویسے ہر روز مجھے امید رہتی تھی کہ آج میرا بیٹا اپنی زندگی کے بینک سے ٹیلینٹ کا چیک کیش کرا کر ہی گھر لوٹے گا۔ لیکن ادھر کئی دنوں سے میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے قدم تھکنے لگے تھے۔ گھر سے نکلتے وقت اس کے ڈگمگاتے لڑکھڑاتے قدم رک رک کر میرے دل پہ ہتھوڑے کی طرح برسنے لگتے تھے۔ ایسے وقت میں میں درد سے تلملا اٹھتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اسے لوٹ جانے کے لئے کہوں۔ لیکن کہہ نہیں پاتا۔ کیسے کہتا میں اسے۔؟ اس کی پیدائش کے دن ہی میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس ننھی سی جان کو اچھی شکچھا دلوا کر نویگ کا ایسا ناگرک بناؤں گا، جس پر ساری دنیا فخر کرے گی۔ یہی وہ خواب تھے میرے۔ اپنے حصے کی ایک ایک روٹی کاٹ کر جب اسے میں نے ایم۔ ایس۔ سی تک پہنچایا تب مجھے اس سے اتنی امید بندھ گئی تھی کہ اب ماہ دو ماہ کے اندر نوکری خود اپوائنٹ منٹ لیٹر کے چکے لگا کر اس کے پاس چلی آئے گی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس لیے میں اندر ہی اندر ٹوٹنے بکھرنے لگتا۔ ریٹائر منٹ کے سارے پیسے ہاتھ سے نکلتے ہی آنے والا کل ایک نئے سوال کے ساتھ میرے بڑھاپے کے دروازے پہ دستک دینے لگا کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے ساتھ اگر بیٹے کی بے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہوا تو تم مستقبل کے آئینے میں اپنے کھردرے اور بے رونق چہرے کو پہچان بھی نہیں پاؤ گے۔

ہر نسل اپنے بعد کی نسل کے بارے میں سوچتی ہے کہ اگر اس کے پاس سائیکل ہے تو اس کے بیٹے کے پاس موٹر سائیکل ہو جائے اور پوتے کی زندگی کے شب و روز کار کی تیز رفتار چھاؤں میں گذریں اور...... اور میں نے بھی اپنی نسل کے بارے میں۔ اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ ایسا ہی خواب دیکھا تھا کہ اسے میں کبھی بھی اپنی طرح بھاری بھرکم لوہے لگے ہوئے جوتے اور گریس موبل میں شرابور پسینہ آلود فیکٹری کے بدبودار کپڑے پہننے نہیں دوں گا۔ وہ تو پڑھ لکھ کر افسر بنے گا۔ بڑا بابو کہلائے گا جس کی سفید شرٹ بے داغ اور ہمیشہ چاندنی میں نہائی ہوئی ہوگی۔ جس کے جوتے ہلکے پھلکے، آئینے کی مانند چمکتے ہوئے زمانے کی گرد سے بے نیاز ہوں گے۔

میرے بابا کسان تھے۔ ہر روز تپتی ہوئی دوپہر میں اپنے جسم کے گلاس میں بوند بوند پسینہ جمع کرتے، سورج کے ہونٹوں کی پیاس بجھاتے اور دھرتی کے سینے پہ کدال سے وار کر کے اپنے حصے کا اناج حاصل کرتے۔ دوپہر کا کھانا لے کر جب میں کھیت میں پہنچتا تو بابا میرے سر پہ گمچھا ڈال کر مجھے کھینچتے ہوئے بانس اور پھوس سے بنے ہوئے مچان کی طرف لے جاتے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی ستو، آم اور بیل کا شربت پلاتے۔

"پی لے بیٹا! باہر لو چل رہی ہے۔ پیٹ ٹھنڈا رہے گا تو لو سے بچے گا۔"

بابا کی ان باتوں پہ میرے چھوٹے سے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا کہ دو قدم چل کر گھر سے کھیت تک آنے جانے میں جب مجھے لو لگ سکتی ہے تو بابا کو۔؟ مجھ سے رہا نہیں جاتا اور میں پوچھ بیٹھتا۔ "اس گرمی میں تجھے لو نہیں لگتی ہے بابا۔؟"

تب وہ ہولے سے مسکرا دیتے۔

"پیٹ کے اندر بھی آگ ہے اور باہر بھی۔ باہر کی آگ سے اگر بچیں گے تو اندر کی آگ جلا دے گی اور اندر کی آگ سے اگر بچنا چاہیں تو باہر کی آگ جلائے۔ جلنا تو ہر قیمت پہ غریبوں کو پڑتا ہے۔ لیکن میں تمہیں اس آگ میں کبھی جلنے نہیں دوں گا۔ کسی بابو کے ہاتھ پیر جوڑ کر فیکٹری میں تجھے کام پہ لگواؤں گا۔ وہاں بڑے بڑے ٹین کے شیڈ کی چھاؤں میں سارا کام ہوتا ہے۔ گرمی سے بچنے کے لئے بڑے بڑے پنکھے بھی لگے ہوتے ہیں۔ آٹھ گھنٹہ ڈیوٹی اور مہینہ پورا ہوتے ہی پگار۔ نہ دھوپ میں پسینہ جلنے کا خدشہ اور نہ ہی جانوروں سے کھیت چرنے کا کوئی ڈر۔"

جب پہلی بار میں نے بابا سے اس طرح کی باتیں سنیں تو خوشی سے اس طرح جھوم اٹھا جیسے کالی کالی گھٹاؤں کے درمیان مور۔ پھر میں آسمان کو چھونے کے لئے بے تاب نظر آنے لگا۔ اسکے ساتھ ہی ساتھ ایک خواب میری کم عمر آنکھوں میں بھی پلتا رہا۔ ہر ماہ ڈھیر سا پگار ملے گا۔ اسے بڑے سے بکس میں جمع کروں گا۔ گاؤں کے سارے کھیت خرید لوں گا۔ بابا راتوں رات ایک غریب کسان سے زمیندار بن جائیں گے۔ اپنا پکے کا گھر ہوگا۔ نوکر چاکر ہوں گے اور......

وقت کی دھرتی پہ چلتے چلتے میں جوان ہونے لگا۔ رات کو سوتے جاگتے میرے اندر سائرن کی آوازیں گونجنے لگیں۔ جیسے مجھے کوئی آواز دے رہا ہے۔ فیکٹری کی مشینیں چنگھاڑ چنگھاڑ کر مجھے بلا رہی ہیں۔ چمنیوں کے دھوئیں سگنل دے کر مجھے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اور ادھر میرا بابا بھی اب مجھے جلد سے جلد شہر بھیج دینا چاہتے تھے۔ اپنے دوست کے پاس۔ جو کسی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ بہت پہلے جب فیکٹری والے ان کے دوست اپنا کھیت دیکھنے کے لئے گاؤں آئے تو بابا مجھے اپنے ساتھ لے کر ان کے پاس گئے تھے۔ مجھے ان کے پاؤں چھونے کے لئے کہا تھا۔ اور بتایا تھا کہ "یہ میرا بچپن کا دوست ہے۔ شہر میں رہتا ہے اور فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ بڑا ہو کر تجھے میں ان کے پاس بھیج دوں گا۔ صاحب سے بات چیت کر کے......

"ابھی چھوٹا ہے۔" انہوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر بابا سے بولے۔

"بڑا ہونے دو۔ پھر میرے پاس بھیج دینا۔ فیکٹری میں کسی بھی صاحب سے کہہ کر کوئی کام لگوا دیں گے۔ تم چنتا نہ کرو۔"

بابا کے لئے میں ہر روز کھیت میں ستو، پیاز، مرچ اور اچار لے کر جایا کرتا اور ہر روز ان کو کھیتوں سے لڑتے جھگڑتے مٹی میں لت پت پا کر وہاں رکنا اور ان کا ہاتھ بٹانا چاہتا۔ لیکن بابا مجھے کھیت میں کبھی رکنے نہیں دیتے۔ ہر روز میرے ہاتھ سے کدال چھین لیتے اور فیکٹری کے سہانے خواب دکھا کر گھر بھیج دیتے۔

برسوں بعد بابا کے وہی فیکٹری والے دوست اپنے کھیتوں کی بوائی کٹائی کے لئے گاؤں آئے۔ واپسی میں بابا نے میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ کندھے پے جھولتے ہوئے گمچھے سے اپنی آنکھوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے بابا بولے۔

"آج اتنی کڑی محنت کے بعد بھی کسانوں کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ کھانے کے لئے کبھی کبھی پیسے جٹا پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن فیکٹری والوں کی آج بھی پوجا ہوتی ہے۔ شہر کی بھول بھلیوں میں اپنے اس بابا کو یاد رکھنا۔"

تب سے لے کر میں دو سال پہلے تک فیکٹری میں کام کرتا رہا تھا۔ پیسے بھی خوب

کمائے تھے لیکن جب زمین خریدنے کے دن آئے تو ایک دن میرے بابا تپتی دوپہر میں کھدائی کا کام کرتے کرتے لو کی زد میں آگئے۔ کھیت میں ہی چکرا کر گرے اور مٹی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چپک گئے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد میں ماں کو اپنے ساتھ شہر لے آیا۔ یہاں بھی ان کی طبعیت بحال نہیں ہوئی۔ بابا کے غم میں ابتر سے ابتر ہوتی چلی گئی۔ اس بیماری میں بھی انہیں صرف ایک ہی دھن تھی۔ میرے سہرے کی۔ بابا کی موت کے سال لگتے ہی ماں نے گاؤں کی ایک بھولی بھالی لڑکی کو میری زندگی کی کھونٹ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باندھ دیا۔ سال بھر کے اندر ہی پوتے کو کھلانے پلانے اور نہلانے دھلانے سے لے کر پیشاب پاخانہ صاف کرنے کا سارا سکھ ماں کو نصیب ہوا۔ اور وہ بابا کے غم کو آہستہ آہستہ پوتے کی خوشی میں بھولنے لگیں۔ لیکن اچانک ایک دن پوتے کو نہلانے کے دوران دل کا دورہ پڑا اور ...... اور اپنی ہونے والی پوتی کو بغیر کھلائے پلائے ہی ہم سے ناراض ہو کر بابا کے پاس چلی گئیں۔

اس بڑھاپے میں اب میری بیوی بھی زندگی کی آخری ڈور میری طرف سے کھینچ لینا چاہتی ہے۔ اس کی بیماری ایسی ہے کہ ٹھیک ہی نہیں ہوتی۔ کافی علاج کروایا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ پت میں پتھر ہے۔ اس عمر میں آپریشن خطرے سے خالی نہیں۔ آپریشن کے نام پر ہی وہ ''نا۔نا'' کہنا شروع کر دیتی ہے۔ بہت ڈرتی ہے وہ۔ کہتی ہے کہ مر جاؤں گی۔ آج سوچتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر کے کہنے پر وہ آپریشن کے لئے تیار ہو جاتی تو...... گھر کا چولہا بھی وقت کے آنسوؤں سے بہت پہلے ہی بجھ گیا ہوتا۔ بیٹی بھی ہاتھ پاؤں نکالے۔ باہر جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ لیکن میری مفلسی کی سڑک سے ہو کر گذرنے والی کوئی بھی گاڑی میرے ہاتھ دینے کے بعد بھی نہیں رکتی۔ شاید رفتہ رفتہ گاڑی والوں کو یہ علم ہو گیا تھا کہ ایک ریٹائرڈ باپ اس کی مرضی کے مطابق گاڑی کا کرایہ بھلا کہاں دے پائے گا۔

ادھر کچھ دنوں سے میری بیٹی کافی اداس رہنے لگی تھی۔ میرا بیٹا اس کے مرجھائے ہوئے گلاب چہرے کی شگفتگی لوٹانے کے لئے صبح سے شام تک اور کبھی رات ڈھلے خاموش قدموں کے ساتھ گھر لوٹا کرتا تھا۔ روزانہ گھر سے باہر نکلتے وقت میری بیٹی بڑے ارمانوں سے لنچ بھرا پیکٹ اس کے ہاتھوں میں دیتی۔ برآمدے کے پائے سے ٹیک لگائے اسے جاتے ہوئے دیر تک دیکھتی۔ پرارتھنا کرتی۔ شام ڈھلے وہ پھر اسی پائے کے پاس آکر

کھڑی ہو جاتی۔ چمچماتے ہوئے خوشیوں بھرے چہرے کے لوٹنے کا انتظار کرتی۔ لیکن دور سے ہی جب اپنے بھائی چال میں ڈگمگاہٹ کے ساتھ ناامیدی کی جھلک دکھائی پڑنے لگتی تو وہ اپنے دوپٹے سے چہرے کو پوچھتے ہوئے اندر کمرے میں چلی جاتی۔ لیکن جب اسے لگتا کہ دوسرے کمرے تک اسکی سسکی پہنچ جائے گی، تب وہ چپ ہو جاتی اور لوٹے میں پانی بھر کر آنگن میں چلی جاتی۔ منہ دھوتی اور کچن کی طرف بڑھ جاتی۔ یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے میرے ساتھ پتنی کی آنکھیں بھی سوج چکی تھیں۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں ایسے وقت میں جب بھی میری طرف اٹھتیں تو ایسا لگتا جیسے کہہ رہی ہوں۔ "تم نے میرے بیٹے کو گمراہ کیا ہے۔ تم گناہ گار ہو۔"

میں واقعی اب اپنے آپ کو اپنے بیٹے کا گناہ گار سمجھنے لگا تھا۔ آج میں اس کے لوٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ خود کو سمجھانا اور اسے سمجھنا چاہتا تھا کہ رات یہی کوئی نو بجے کے آس پاس ایک بار پھر وہ ناامید گھر لوٹا۔ چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جسم کا ایک ایک انگ ٹوٹا ہوا تھا۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بال بکھرے اور دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ وہ ہر روز چپ چاپ کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ لیکن چارپائی شاید دروازے کے پاس ہونے کی وجہ سے وہ میری طرف ایک نظر دیکھتا ضرور تھا۔ آج بھی اس کی نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن اس وقت اپنے بیٹے سے نظریں ملانے کی تاب مجھ میں کہاں تھی۔؟ اس کا ٹوٹتا بکھرتا وجود میری جھکی ہوئی پلکوں سے اکثر سوال کرتا۔ "باپو اگر تو نے وقت پہ میرا رجسٹریشن کمپنی میں کروایا ہوتا تو میں در بدر بھٹکنے کے بجائے آج تیری جگہ .... لیکن مجھے تو کمپنی اور کمپنی کی بڑی بڑی آگ اگلتی ہوئی بھٹیوں اور دھواں پھینکتی ہوئی چمنیوں سے چڑھ تھی۔ میں نے کمپنی کے آئینے میں نئی اور پرانی تصویروں کو الٹ پلٹ کر بہت قریب سے دیکھا تھا۔ صحت مند چہروں پہ وقت کی گرد جمتے ہی آنکھیں دھنس جاتی تھیں۔ گال پچک جاتے تھے۔ اور بھٹیاں ساٹھ سالہ زندگی کا سارا رس نچوڑ کر انسانوں کی ہڈی پسلی پر ریجیکٹ کی مہر مار کر بے کار شئے کی طرح مشینوں کے ذریعہ باہر پھینک دیتی تھیں۔

میں بہت خوش تھا لیکن یہ کیا ہوا: چمنیوں اور بھٹیوں سے بچانے کے بعد بھی

دو سالہ نوکری کی تلاش نے دفتر میرے خون جگر کو اتنا تڑپایا تھا کہ آج اس کی حالت بھٹیوں اور چمنیوں کے آس پاس زندگی گذارنے والے لوگوں سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ جوانی میں بڑھاپے کا رول نبھاتے دیکھ کر مجھے اپنے بیٹے پر ترس آجاتا لیکن اس کا ذمہ دار...... اس لئے ہمیشہ مراسر اس کے سامنے جھک جایا کرتا۔

آج بھی میرا سر گناہ کے بوجھ سے جھکا ہوا تھا۔ ماں سے نظریں بچا کر وہ آگے بڑھ گیا۔ آنگن میں اس نے دیکھا کہ بہن چہرہ دھو رہی ہے۔ وہ فائل شیلف پہ رکھتے ہوئے سیدھا کنویں کے پاس چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھوئے۔ اور ہمیشہ کی طرح آنگن میں رکھی ہوئی چارپائی پہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔ بہن نے بھائی کے لئے پہلے چائے بنائی۔ پھر تین چار روٹیاں سینک کر ہی وہ اٹھ گئی۔

"بھیا کھانا کھالو۔"

وقت کی ٹھوکر کھائے ہوئے بھائی نے جب اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو چھوٹی بہن کی آنکھوں کی ویرانی میں اداسی کے ڈھیر سارے پرندوں کو پھڑ پھڑاتے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کی نظریں چولہے کی طرف اٹھ گئیں۔

"تمہارا چولہا تو بجھ رہا ہے۔ لکڑی یا کوئلہ کیوں نہیں ڈالتی۔؟"

"ایندھن نہیں ہے۔ باپو کو بولی تھی۔ لیکن ...." وہ چہرہ دوسری طرف گھماتے ہوئے سسک پڑی۔

"پگلی! چلو تم روٹی بناؤ۔ ایندھن کا انتظام میں کرتا ہوں۔" اس نے اٹھ کر مضبوطی سے اپنی بہن کا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ دیر وہ یونہی آسمان کی طرف خالی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اندر کمرے میں چارپائی پہ لیٹا لیٹا کھڑکی سے کچن کا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ میری پتنی بھی میرا ساتھ دینے کے لئے میری چارپائی پہ آکر میرے پیتانے بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر تھیں کہ تبھی دوسرے روم سے پرانے صندوق کے کھلنے کی آواز آئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کھٹ کھٹ کی تیز آواز ہوئی۔ وہی جانی پہچانی سی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جسم کپکپانے لگا۔ تبھی میں نے دیکھا کہ میرا بیٹا ایک ہاتھ میں

ڈگری والی فائلیں لئے پاؤں میں میرے ہی بوسیدہ آہنی جوتے پہنے کھٹ کھٹ کرتا ہوا کمرے سے نکلا اور کچن کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ بہن نے بھائی کے ارادے کو بھانپتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے فائل چھیننا چاہی۔ لیکن بھائی نے بہن کے ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے اپنی ڈگری کی ساری فائلیں چولہے میں ڈال دیں۔ اینددھن ملتے ہی ایک بار پھر چولہے کا منہ روشن ہو گیا۔

"میں مرا نہیں، زندہ ہوں۔ کھانے پینے سے لے کر تمہاری ضرورت کی ساری چیزیں......... "میرے بیٹے نے بھاری بھرکم آہنی جوتے کی طرف دیکھتے ہوئے آگے کہا۔"اب میری بہنا کے لئے کرایہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ ہماری مرضی سے گاڑیاں یہاں رکا کریں گی۔"

بیٹے کے پاؤں میں اپنے ہی بھاری بھرکم بدبودار آہنی جوتے کو دیکھ کر میری بوڑھی آنکھوں میں غصہ سماتا ہی چلا گیا۔ پتنی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے اس کے کمزور ہاتھوں کو اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اسے اس طرح سے جھٹک دیا کہ وہ بے چاری درد سے بلبلا اٹھی۔

تڑاخ !!!

حرام خور! کیا میں نے تمہیں اسی دن کے لئے پڑھایا تھا کہ تم پڑھ لکھ کر کوئی کباڑی کی نوکری کرو اور اس بھاری بدبودار جوتے کو پہن کر......... فوراً اتار دو اس جوتے کو۔ نہیں تو......... "میں غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

لیکن جب وہ ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح میرے حکم کو حرف آخر مان کر جوتے میری طرف بڑھانے لگا تب میری بوڑھی آنکھوں کے کیمرے نے بیمار بیوی اور جوان بیٹی کے پژمردہ چہرے کی تصویر یکے بعد دیگرے کھینچ لی۔ میں نے ہڑبڑا کر جوتے واپس اس کے پاؤں کے پاس رکھ دئے۔

"میرے اور تیرے جوتے کا نمبر لگتا ہے ایک ہی ہے بیٹے"......... میرے سینے سے الگ ہوتے ہی اس نے پہلے اپنے پاؤں کو دیکھا اور پھر......

کھٹ کھٹ کی وہی آواز......اور بابا کا صدیوں پرانا مسکراتا چہرہ ایک بار پھر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

☆☆☆

بابل کا مینار

مجھے اس قبر میں صدیاں بیت چلی ہیں، اور آج پھر میری آنکھوں کے سامنے وہی منظر ہے...... وہی، جو میں نے صدیوں قبل اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

مینار۔

بابل کا مینار۔

جب پرندوں کے تازہ پنکھ نکل آتے ہیں تو وہ کافی اونچائی پہ پرواز کرنے کے خوابوں میں اسیر ہو جاتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیر جب اپنے نقطہ عروج پر پہنچتی ہے تو ان کے پنکھ لہو لہان ہو جاتے ہیں اور وہ پلک جھپکتے ہی آکاش کی بلندیوں سے گر کر زمین کی گہرائیوں میں دفن ہو جاتے ہیں۔

بالکل وہی منظر......

ان کے بازوؤں میں قوتِ پرواز کے حوصلے سرگرم تھے۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ دماغ کے تاریک کمروں میں روشنی کا مینار اپنی تیز شعائیں ڈالنے لگا تو انہوں نے بے چین ہو کر زمین کے ایک وسیع خطے میں اس مینار کی بنیاد ڈالی۔

کام جاری تھا۔

مزدور اینٹ، پتھر، بالو، سمنٹ اور چھڑ لئے کسی آٹومیٹک مشین کی طرح نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے کے اس عمل میں پوری طرح محو رقص تھے۔ لیکن وہیں چند ایک لوگوں کی آنکھیں مینار کی بنیاد پڑتے ہی حیران ہو اٹھی تھیں۔

فرش سے عرش کا لامتناہی سفر۔

واقعی یہ بات تعجب خیز تھی! بھلا کوئی کیا نتیجہ اخذ کر سکتا تھا۔؟ لیکن چند ایک کی آنکھوں سے خوشیاں بوند بوند ٹپک کر دھرتی کے سینے سیراب کرنے لگی تھیں۔ اور اس سیرابی نے کچھ دنوں کے بعد دھرتی کے بطن پر جہنمی پھول کھلا دئے تھے۔

ہوا

پانی

خلا

تینوں جگہوں پہ جب ان لوگوں کو کامیابیاں ملنے لگیں تو گوشت کے ان لوتھڑوں میں غرور کا نشہ طاری ہوتا چلا گیا۔ اور پھر وہ لوگ راکٹ کے دھوئیں کی طرح اپنی کامیابیوں کو ایک کے بعد ایک پیچھے چھوڑتے ہوئے قدیم اسرار سے پُر نیلگوں دبیز پردوں کو اٹھانے کے لئے شب و روز کی سڑک پر رواں دواں ہو گئے۔ ان لوگوں کے اس انوکھے پلان پر ساری دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ وہ لوگ ساری دنیا کی آنکھوں میں حیرت واستعجاب کا رنگ گھول کر ہر ایک سے پرے اپنا منفرد مقام بنانے کے خواب کا سنہرا منظر نامہ ترتیب دے رہے تھے۔ تاریخ کے اوراق میں سنہری حرفوں سے ایک ایسے باب کی تخلیق کرنا چاہتے تھے، جن پر نظریں پھسلتے ہی ہر دور کی آنکھیں لہو لہان ہو جائیں۔

مینار کی تعمیر کا کام شباب کے زینے طے کر رہا تھا۔

وقت کے مختصر سے حصے میں ان لوگوں نے اپنی محنت و لگن اور اپنے دماغی کیڑوں کی مدد سے مینار کی کئی منزلیں تیار کر لیں۔

لوگوں کے منہ سے مسرتوں کے لاوے اُبل رہے تھے۔

اور آنکھیں......

چمکتی ہوئیں۔!

پھسلتی ہوئیں۔!!

پھیلی ہوئیں۔!!!

ٹھہری ہوئیں۔!!!!

طلوع اور غروب ہو رہی تھیں، لیکن ان کا تاریخ کے اوراق میں کوئی ذکر نہ تھا۔

مینار شباب کے زینے عبور کر رہا تھا، اور سوکھے شجر ثمر آور ہو گئے تھے لیکن ان پھلوں میں مٹھاس کی جگہ غرور و تکبر کی کھٹاس شامل تھی۔

"انسان کے لئے اب کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔"

......ایک نے مینار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگوں کی شب و روز کی محنت! ممکن ہے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مینار کے ہاتھ پاؤں لمبے ہوتے چلے جائیں، اور ایک دن...... اچانک نیلگوں سمندر میں کوئی بھیانک طوفان آجائے، پھر فتح کس کی ہوگی۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا...... وہ خواب جو برسوں ہماری آنکھوں نے بُنا ہے، حقیقت کا روپ لے کر ہماری آنکھوں کے سامنے کروٹیں بدلے گا یا نہیں......

"بدلے گا۔ ضرور بدلے گا۔ اور ایک دن ہماری محنت......" دوسرے نے اس کی ڈگمگاتی ہوئی باتوں کو اپنے لفظوں کی بیساکھی کا سہارا دیا۔

بونے وقت کے دھارے میں مینار اپنا قد ابھارتا رہا۔ اور واقعی قد آور لگنے لگا۔

مینار کے چاروں طرف لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔

"اچھا تو تم بتاؤ! اس مینار کے بننے میں کتنے دن لگیں گے۔"؟

"اتنے کم عرصے میں مینار کی اتنی منزلیں تیار ہو گئی ہیں، اور ایک منزل کی اونچائی اتنی ہے۔ اور فرش سے عرش کی دوری اتنی ہے...... اتنے دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

"ارے واہ! تب تو اتنے دن کے اندر ہم لوگ عرش کی سیر بھی کر آئیں گے۔"

"بڑا مزہ آئے گا۔"

"ہاں، کیوں نہیں!۔ مزہ تو آئے گا ہی کہ جنت اور جہنم ہمارے دو ہاتھوں میں دھرے ہوں گے۔"

پھر قہقہوں کی موسلادھار بارش......

اور فضا میں سرور کا نشہ ہی نشہ چھاتا چلا گیا۔

مینار اب شباب کے زینے عبور کر چکا تھا۔ چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

"اے مرشد! بتاؤ کہ کیا واقعی اس نیلی چھتری کے اوپر کوئی رہتا ہے۔؟" مرید نے مرشد سے دریافت کیا۔

"لگتا ہے دن رات گندے خواب دیکھنے کی وجہ سے تمہارے ذہن میں کوئی ایسا زلزلہ آگیا ہے 'جس سے تمہارے دماغ کی اینٹیں اپنی جگہ سے پرے کھسک گئی ہیں۔ جاکر غسل کر اور پاک وصاف ہو جاکہ یہ سب ناپاکی کے اثرات ہیں۔

لوگوں کی بھیڑ کے ساتھ مینار کی سیڑھیوں پہ یہ دونوں بھی چڑھتے رہے۔

اس مینار سے متعلق اور بھی بہت ساری باتیں گروہوں میں بٹے ہوئے لوگوں کے بیچ اور گھروں میں اپنی بیویوں کی قربت کی کشش میں اسیر لوگوں کے درمیان ہوتی تھیں۔ ابھرتی تھیں اور دھواں آلود فضا میں تحلیل ہو جاتی تھیں۔

"یہ ساری باتیں فضول اور بے بنیاد ہیں۔" مرشد چلایا۔

"لیکن میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ نیلی وسعتوں کے پیچھے کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ اسی نے اس دنیا کی تخلیق کی ہے اور ہم انسانوں کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔"

"میں نے بھی اتنا ہی سنا ہے، کیا اس کا حقیقت سے......" ایک اور مرید سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"میں اس بات کو نہیں مانتا کہ کسی نے ہمیں بنایا ہے۔ میں پوچھتا ہوں اگر کسی مصور نے مٹی کے کھلونوں میں جان ڈال کر میرے وجود کی تخلیق کی ہے۔ تو وہ کہاں ہے۔؟ کبھی تو میری آنکھیں اسے دیکھتیں۔" پھر اس نے اچانک رک کر پہلے والے سے سوال کیا۔

"کیا تمہاری آنکھوں نے اس مصور کو دیکھا ہے۔؟"

"نہیں۔!"

ایسے کئی ایک سوال و جواب کا سلسلہ دوسری طرف بھی جاری تھا۔

"تو پھر میں کیسے یقین کرلوں کہ اس نے ہمیں......؟" الف نے ب سے کہا۔

"مت کرو........ تمہیں کون کہتا ہے کرنے کو۔ لیکن تم نے اپنے باپ کو بھی نہیں دیکھا ہوگا۔"

"نہیں دیکھا ہے۔ کیونکہ میری پیدائش سے قبل ہی وہ تیری ماں کے ساتھ......"

ہاہا، ہی ہی......

ہی ہی، ہاہا............

"اس مینار کو دیکھ رہے ہو نا۔؟" ایک ٹھگنے نے مینار کی چکنی دیوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہم لوگوں کی شب و روز کی محنت و لگن کا ثمر ہے۔ اگر مینار کی آنکھیں ہوتیں تو وہ ہم سبھوں کو ضرور دیکھتیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہماری ان دو آنکھوں میں اتنی روشنی نہ ہو کہ ہم انہیں دیکھ سکیں۔" ایک کتے جیسی صورت والے نے بھونکتے ہوئے کہا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو یار......؟" ٹھگنے نے برا سا منہ بنایا اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی تمام چیزوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے اپنی آنکھوں کے صحیح ہونے کا خود کو یقین دلایا، پھر کچھ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"اچھا! اب تم ہی بتاؤ کہ اس نے ہمیں کس طرح پیدا کیا۔؟" فلسفی نے سوال اچھالا۔

"معلوم نہیں۔" عقل کے کورے نے ہولے سے کہا۔

"تو پھر تمہیں کیا معلوم ہے۔؟ کان صاف کر کے سن لو کہ مجھے کسی نے پیدا نہیں کیا، اور ہاں ایک انسان کا وجود انسان کے لہو سے جدا نہیں۔ یہ لہو نہ ہو تو پھر وہ جرثومہ پیدا نہیں ہوگا جس نے بندر کو انسان بنایا۔"

"مجھے لگتا ہے تمہارے اندر ڈاروِن کی روح سمائی ہے۔"

مینار زینہ بہ زینہ اوپر اٹھتا رہا۔۔۔۔کام اپنے آخری مرحلے میں تھا۔

فرش اور عرش کے بیچ سے دوریوں کا لامتناہی سلسلہ معدوم ہو رہا تھا۔ ان کے جسموں سے غرور اور انا کے دھوئیں نکل کر فضا کو تاریک بنا رہے تھے۔ پنکھ پھڑ پھڑانے کی آوازیں ہواؤں میں تحلیل ہو کر ہر جہت بکھر رہی تھیں۔

"اب کوئی بیرونی قوت، انسانی وجود کو عرش کی سیر کر آنے سے نہیں روک سکتی۔ اگر کسی نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تو ہماری قوت اس طاقت کو ہمیشہ کے لئے کسی گہرے سمندر میں دفن کر دے گی۔"

"ہاں یہ ایک چیلنج ہے۔"

"چیلنج۔"

"ہماری طاقت کا لوہا ساری دنیا نے مانا ہے۔ انتظار کا سورج بھی غروب ہو رہا ہے۔ اس گمنام وجود پر سے اب تاریکی کی دبیز چادر سرکنے ہی والی ہے۔ کیونکہ اب ہم لوگ عرش کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ اگر اس کے وجود کا حقیقت سے رشتہ ہے......؟

"تو وہ کہاں ہے۔؟"

"کس جگہ ہے۔؟"

کس حالت میں ہے۔؟"

"اسے ہماری آنکھیں بآسانی دیکھ لیں گی۔ پھر ایک ملاقاتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ......"

"انٹرویو۔!" صحافی نے ہواؤں میں ہاتھ اچھالا اور آسمان کی طرف فاتحانہ مسکراہٹ سے دیکھا۔

"عرش پر بھی ہمارا جھنڈا لہرائے گا۔"

"اسٹار وار (starwar)

"نہیں! وہاں نسل در نسل صرف خدا کے منکر پیدا ہوں گے۔"

مینار کی اس کامیاب تعمیر پر ہر سمت سے قہقہوں کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ مسرتوں اور فتح مندی کی بوندیں ان کے جسموں سے رس رہی تھیں۔ غرور و تکبر کا رنگ ان کے وجود پر

غالب تھا۔

اب ان کے قدم فرش سے خلاؤں میں منتقل ہو چکے تھے۔ فاصلے سمٹ گئے۔ مگر اب بھی عرش اور فرش کے بیچ فاصلے کی ایک ہلکی سی لکیر موجود تھی۔

"ذرا دیکھو تو ہمیں...... ہمارے بدن پر کتنے بڑے بڑے پنکھ اگ آئے ہیں...... اور اب ہم سب عرش کے کتنے قریب آگئے ہیں۔"

"ہم لوگوں کی برسوں کی محنت......"

ہا۔ہا۔ہا۔'

ہی۔ہی۔ہی۔'

ہو۔ہو۔ہو۔'

نیلی وسعتوں کے اس پار والے نے جب ان لوگوں کی عجیب و غریب حرکتیں دیکھیں تو ان کے وجود سے ایک کرن پھوٹنے لگی۔

پسِ منظر......

نایاب مینار...... سمٹتے فاصلے۔ طویل راستہ۔ کلبلاتے دماغی کیڑے۔ عرش کی بے شکن دھرتی پر لہو کے بے شمار دھبے جگہ بہ جگہ پھیلے ہوئے۔ عرش پر لہراتا ہوا فرش کا جھنڈا۔ اصول و قوانین کی موت۔

"کیا اسی دن کے لئے اس نے دنیا میں انسانوں کو اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا تھا۔ ان کے بازوؤں کو مضبوط کیا تھا۔"

دفعتاً طوفان کے آثار نمایاں ہوئے۔ بارش کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مگر ان لوگوں پر اس بارش اور طوفان کا تھوڑا بھی اثر نہیں پڑا۔ اور وہ لوگ پہلے ہی کی طرح مگن رہے۔

اخبار، ٹیلی ویژن، ریڈیو چلا رہے تھے۔

"اسٹار وار (starwar)"

یہ کھلم کھلا اعلان جنگ تھا۔

یکایک ہوائیں پاگل ہو اٹھیں۔

عمارتیں نیست و نابود ہوتی چلی گئیں۔

اشجار سجدہ ریز ہو گئے۔

مینار طوفان میں جھومتے ہوئے درخت کی مثال پیش کرنے لگا۔

اور اس کی پرت کرچیوں میں تبدیل ہو کر روئی کے گالوں کی شکل میں، فضاؤ میں اڑنے لگی اور تیرنے لگی اور ہچکولے کھانے لگی۔

زوال کا وقت سرکتا ہوا سر پر آن کھڑا ہوا۔

سورج چھوٹے چھوٹے آگ کے گولے برسانے لگا۔

زمین و آسمان نے ان گنت سمندروں کا منہ کھول دیا۔

انسانیت کی کشتی ہچکولے کھانے لگی۔

پہاڑ، پٹھار اور میدان اپنی شکل کھونے لگے۔

چیخ و پکار کی آوازیں ہر سمت سے اچھالی جانے لگیں۔

اور زمین کی جل تھل سطح پر لاشیں ایک کے اوپر ایک تیرنے لگیں۔

پھر سمندر میں گہرا سکوت۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ ایک ایسی خاموشی کہ جو اس وقت بھی تھی جب دھرتی کے اسرار پر تاریک غلاف چڑھا ہوا تھا اور خدا کا وجود تاریک پانیوں پر تیرتا تھا۔

اب مینار فنا ہو چکا ہے۔ اور وہ سب بھی جنھوں نے اپنے تازہ پنکھوں پہ بھروسہ کرتے ہوئے آسمان کی نیلی وسعتوں کو کھنگالنے کا تہیہ کیا تھا۔ لیکن آج بھی میری آنکھیں سلامت ہیں اور یہ قبر بھی......! جواب میری جائے پناہ ہے۔ پتہ نہیں میری یہ آنکھیں اب کن منظروں سے گذرنے والی ہیں کہ آسمان میں آج بھی سورج اور چاند چمک رہے ہیں، اور ستارے اپنے جھرمٹوں میں اسرار کے بے پناہ امکانات سمیٹے ہوئے مسکرا رہے ہیں اور میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ دھرتی پہ اسی جگہ جہاں کہ وہ مینار ہوا کرتا تھا، وہیں پر ایک معصوم بچہ اپنے انگوٹھے کو منہ میں دیئے آسمان کی نیلی وسعتوں کا جائزہ لے رہا ہے۔ لیکن ابھی اس کے پنکھ نہیں نکلے ہیں۔

☆☆☆

تم پھر آؤ گے

رات بھیگ کر سو چکی تھی لیکن آشا بارود کی ڈھیر پر کھڑی اب تک سسک رہی تھی۔

آج وقت کا ظالم ازلی طوفان سرِ شام اس کے نیند نگر کو اجاڑ کر اس کی آنکھوں میں کاجل کی کہانی لکھ گیا۔ وہ ساری رات کروٹ کروٹ درد بن کر بستر کی سلوٹوں سے الجھتی رہی کہ پانچ سالہ پریت اس کی کہانی کا ایک انوکھا باب تھا جو آج کی رات زندگی اور موت کے درمیان کا سفر اسپتال کی سڑکوں پر طے کر رہا تھا۔

رات تاریکی کی چادریں لپٹی، سمٹی اور خاموش کھڑی تھی۔ ایسی رات میں سڑک پر دو ننھے منے پاؤں کے چلنے کی آواز سے کبھی اس کی روح کے تار ٹوٹتے تو کبھی خوشیوں کے ستارے اس کی آنکھوں کے آسمان پر بکھر جاتے۔

چاپ قریب اور دور ہوتی رہی۔

اس آنکھ مچولی سے آشا کا پیراہن پارہ پارہ ہونے لگا تھا۔ پاس آتی ہوئی آواز پر وہ دروازہ کی طرف جھپٹتی۔ چٹخنی تک ہاتھ لے جاتی۔ ہاتھ نیچے کھینچنے سے پہلے ہی چاپ دور ہو

جاتی۔ پھر وہ اداس پاؤں سمیٹے بستر تک لوٹ جاتی۔

لیکن اس بار چاپ بالکل گیٹ کے قریب آگئی تھی جس کی دھمک ایک ماں اپنے سینے پر صاف سن رہی تھی۔ وہ دروازہ کی طرف جھپٹ پڑی۔ چٹخنی تک ہاتھ ابھی پہنچ بھی نہیں پایا تھا کہ سڑک سے تیز بات کرتی ہوئی ایک کار آئی اور دو ننھے منے پاؤں کی چاپ کو اپنے چکے میں لپیٹ کر دور دھند میں گم ہو گئی۔

آشا کی دلدوز چیخ کیساتھ دھڑام کی آواز ہوئی اور دونوں پٹ جھول گئے۔

سامنے کار کھڑی تھی۔ سامنے سریندر ناتھ بھی کھڑا تھا جس کے چہرے پہ انگنت اڑی ترچھی لکیریں تھیں جس نے اس کے سانولے چہرے کو اور بھی دھندلا دیا تھا۔ دھندلے چہرے کو آشا ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ پھر عجیب سی کیفیت سے وہ دوچار ہوتی چلی گئی۔

ہاتھ سخت ہو گئے۔ آنکھیں دھندلا گئیں جسم پر ایک عجیب سا لرزہ طاری ہو گیا۔

"کچھ بولتے کیوں نہیں۔؟ چپ کیوں ہیں۔؟" آشا سریندر ناتھ کا کالر پکڑ کر چیخ اٹھی۔

"نہیں۔ کچھ نہیں۔!"

اس ایک جملہ میں سریندر ناتھ نے جانے کہاں سے کائنات کا استادرد سمیٹ دیا تھا کہ آشا کی بھیگی آنکھیں سوکھی لکڑی کے ڈھیر پر جا کر ٹک گئیں۔

آشا کے اندر بکھرنے کا عمل جاری رہا.....

پھر فضا میں جانی انجانی سی مہک گھل گئی اور پل دو پل میں آسمان سرخ ہو گیا۔

شام ہوئی اور سب لوٹ گئے۔ لیکن وہ رات تک پلکوں سے راکھ کریدتی رہی۔ اس ایک چہرہ کو تلاش کرتی رہی جو اس کا سرمایۂ حیات تھا۔ وہ چہرہ راکھ سے الگ ہو کر بار بار اسے زیروکس (XEROX) کی کہانی سناتا..... وہ اسے پکڑنے کی کوشش میں آگے بڑھتی۔ ہاتھ بڑھاتی اور وہ راکھ راکھ ہو کر بکھر جاتا۔

آشا بھی ایک بکھری ہوئی عورت ہے۔ پھر [illegible] اس کے گھر والوں نے اس کی

آشا کا خون کر دیا تھا۔ وہ بہت روئی تھی۔ چلائی تھی۔ لیکن اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ آخر کار باپ کی انااور سماج کی عزّت کی خاطر اسے زمانے کے آگے جھکنا پڑا۔

سریندر ناتھ کے ساتھ وہ زندگی کی سڑک پر یوں ہی بے ڈھنگی سی چال چلتی رہی ہر موڑ پر رک کر چہار طرف آنکھ رکھتی۔ ہر آہٹ پر پیچھے مڑتی پھر مایوس نظریں نیچے کیے آگے بڑھ جاتی۔

اس کے اندر ایک خواہش تھی۔ ''وہ اس سے اکثر ملتا رہے۔'' اس خواہش نے اسے بھگوان کے سامنے پرارتھنا کے لیے بار بار کھڑا کیا۔ ''اگر پریتم کو پریم دے سکتا ہے تو مجھے بھی ''آس'' دے۔

آشا کی تپسیا اور پرارتھنا نے ایک بار پھر دھرتی کے صفحے پر زیرو کس کی کہانی کو دہرادیا تھا۔ پریت، سمیر کا کاربن تھا پریت کو پاکر آشا کو ایسا لگنے لگا تھا کہ اس نے کبھی کچھ کھویا ہی نہیں ہے۔

آشا، پریت سے بے حد پیار کرتی تھی۔ اتنا کے دوسرے گود لینے کے لیے ترس جاتے تھے۔ اگر کسی قریبی یا عزیز کی ضد پر دیتی بھی تو پل دو پل کے لیے۔ اور وہ بھی وہیں اور نظر کے پاس۔!

شادی کے بعد آشا کو اپنے باپ سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ہاں، جب کبھی ماں سے ملنے کی خواہش ہوتی، نوکر بھیج کر پاس بلالیتی۔ باپ تو بیٹی کی شکل کے لیے ترس گیا تھا۔ لیکن معلوم نہیں پریت نے آتے ہی آشا پر کون سا جادو کر دیا تھا کہ وہ گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ باپ تو باپ اب آشا اسے بھی ٹوٹ کر چاہتی تھی،۔ جس کی شکل سے کراہیت ٹپکتی تھی۔ جو بچے کی پیدائش سے قبل اسے رات کی تاریکی میں بھوت کی طرح دبائے رکھتا تھا۔

نئی نویلی دلہن کی بے رخی، اکھڑے اور سپاٹ چہرے کو سریندر ناتھ پہلی رات سے ہی دیکھتا آیا تھا۔ جب بھی اس کی روح مجروح ہوتی وہ خود کے سامنے سوال بن جاتا۔

''آشا چپ کیوں رہتی ہے۔؟ کون سا دکھ ہے اسے۔؟ کہیں۔؟''

لیکن شک و شبہات کی یہ دیواریں اس دن منہدم ہو گئیں، جب پربت دھوپ کی

وادی میں شجر بن کر اگا اور جھلتے جسموں کے لیے سایہ بن کر پھیل گیا۔

آشا اب وہ آشا نہیں رہ گئی تھی۔اس کا آس نگر آباد ہو چکا تھا۔وہ ہر طرف مسکراتی ہنستی، ناچتی، اور گاتی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔اس اچانک تبدیلی نے اسے ساری دنیا سے دور کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس بھگوان کو بھی جس نے اسے پریت دیا تھا۔وہاں بھی اب وہ صبح ، شام پھول چڑھانے نہیں جایا کرتی تھی۔ لیکن ایک بار بھگوان کے چرن چھونے کے بارے میں سوچ کر گھر سے نکل پڑی تھی۔راستے میں ہی اسے سمیر یاد آگیا تھا۔وہ پریت کو چومنے لگی تھی۔چومتے چومتے گھر لوٹ آئی تھی پھر کبھی نہیں گئی کہ اس نے پریت کے اندر سب کچھ پا لیا تھا۔

لیکن ایک دن جب آشا نے ایک نقطہ کو دائرہ میں بدلتے ہوئے دیکھا تو خوف سے کانپ گئی۔اس لئے کہ وہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی تھی۔پریت کو پانے کے بعد اس نے بھگوان کو بھی بھلا دیا تھا۔اس لئے وہ بے خوف و خطر ایک شام سریندر ناتھ کے سامنے تھی

"مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔!"

"کیا ہوا ہے تمہیں۔؟"

"میں دوسرے بچے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔"

سریندر ناتھ نے پہلے سوچا کے آشا مذاق کر رہی ہے۔ لیکن جب بات مذاق کی حد سے نکل گئی تب اس نے اسے سمجھانا چاہا۔ نہیں مانی تو ڈرایا اور دھمکایا۔ گھر سے نکالنے کی اور آخر میں جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ آشا سخت پتھر کی بنی تھی۔اس پر طوفانی برسات کا کوئی اثر نہ پڑا۔ لیکن جب پریت سے جدائی کی بات سنی تو کانپ کر رہ گئی۔ آخر کار پریت کی خاطر نو ماہ کے اس طوفانی ہمسفر کو جھیلنے کے لئے آشا نے بڑی مشکل سے خود کو تیار کیا۔

طوفانی سفر اپنے اختتام تک ٹھیک ٹھاک ہی پہنچا۔

لیکن گیت کی زندگی کے اس سفر میں آشا نے اسے اپنی اولاد کا سکھ نہیں دیا۔ گیت کو جنم دینے کے بعد اس نے نخیفی کا ایک خوبصورت ناٹک رچایا۔دو ماہ تک یونہی بستر سے چمٹی

رہی۔ ان دنوں دفتر سے الگ رہ کر سریندر ناتھ کی آنکھوں کی نیند جاتی رہی۔ آشا خوبصورت تھی۔ خوبصورت بیویاں ہی موڈرن دور میں مردوں کی شان میں چار چاند لگاتی ہیں۔ اس لئے وہ نجات چاہ کر بھی کسی قیمت پر اسے کھونے کا دکھ جھیلنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی ایک دن گیت کی وجہ سے دفتر سے نکلنے میں کافی دیر ہو گئی اور جب باس نے پہنچتے ہی ڈانٹا تب اس دن پہلی بار سریندر ناتھ نے آشا کو بہت مارا تھا۔ آشا بھی اپنی ضد پر اڑی رہی تھی۔

"گیت میرا نہیں، تمہارا بچہ ہے۔"

آشا کی کج روی نے سریندر ناتھ کو پریت سے زیادہ گیت کو چاہنے پر مجبور کیا تھا۔ اس لئے کہ گیت کا چہرہ بالکل اسی کی طرح تھا۔ اور یہی سبب ہے کہ آہستہ آہستہ یہ سب کچھ سریندر ناتھ کی عادت کا حصہ بنتا چلا گیا۔ صبح اٹھنا، غلاظت صاف کرنا، نہلانا، دھلانا اور کپڑے پہنانا، جھولے میں جھلا کر دودھ کی بوتل کو جالی میں پھنسا دینا، سلانے کے لئے لوریاں گانا اور گاتے گاتے خود سو جانا۔ گیت کے بغیر اب سریندر ناتھ کا دل دفتر میں نہیں لگتا تھا۔ اس لئے اب وہ جلد گھر لوٹ آیا کرتا۔ گیت کی نگرانی کے لئے اس نے گھر پر ایک بارہ سال کی بچی کو رکھ چھوڑا تھا، تاکہ اس کی غیر موجودگی میں آشا کے قہر سے وہ گیت کو محفوظ رکھ سکے۔ گیت جب پاؤں پاؤں چلنے لگا اور ڈر جب کچھ کم ہوا تو ایک دن سریندر ناتھ نے اس بچی کو اس کے گھر بھیج دیا۔ اس لئے کہ آشا اسے ہر وقت بات بے بات مار بیٹھتی تھی۔

پریت اور گیت کبھی ساتھ تو نہیں رہے تھے۔ لیکن ساتھ رہنے کے لئے اکثر دونوں بے چین رہتے تھے۔ پریت، گیت کو جب چھوٹو کہہ کر پکارتا تو آشا اسے گھور کر دیکھتی۔ جب وہ پاس چلا جاتا تو اسے کھینچ کر لے جاتی۔ اور جب گیت بھائی۔ بھائی کہتا ہوا پریت کے پاس جانے کی کوشش کرتا، یا پھر چلا جاتا تو آشا اس کے کان مروڑ کر وہیں دو چار چپت لگا دیتی۔ گیت روتا ہوا دور جا بیٹھتا۔ دور سے ہی ماں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتا۔ کبھی پاس جانے کا جی چاہتا تو آگے بڑھ جاتا۔ لیکن آشا کی آنکھوں کی لالی اسے آگے بڑھنے سے روک دیتی۔ وہ ہر بار خوف سے پیچھے مڑ جاتا اور ایک کونے میں جا کر چپ چاپ سہم کر بیٹھ جاتا۔

رات بھیگ کر سو چکی تھی، لیکن آشا بارود کی ڈھیر پر کھڑی اب تک سسک رہی تھی۔

پریت اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس کے پاس اب صرف گیت رہ گیا تھا۔ ایسے میں گیت کی طرف آشا کی نظر کا گھوم جانا ایک فطری عمل تھا۔ لیکن ایسے وقت میں بھی گیت کی طرف دیکھنا اس نے گوارہ نہیں کیا۔ اب اس کی دنیا سمٹ کر اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ جہاں چارپائی پر گری ہر وقت وہ الٹی سیدھی باتیں سوچا کرتی۔ کبھی یہ تو کبھی وہ.....اور کبھی دیوار پر لگی ہوئی فریم میں جڑی ہوئی تصویر سے پاگلوں جیسی باتیں کرتی دیکھی جاتی۔

۔اس طرح اس کی زندگی اب بے رنگ، بے معنی، بے لطف اور بے سمت ہو چکی تھی۔!

"انسان کے بس میں بھلی کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو صرف ایک میڈیا ہے"۔

آشا ایسی باتوں سے جھلا جاتی۔ کبھی چیخ کر، کبھی آہستہ، کبھی روتی ہوئی اور کبھی نظروں کو زبان عطا کرتی۔

"تم کیا جانو عورت کا درد۔ مرد ہو نا...؟"

آشا بھیگی آنکھوں کے ساتھ ہاتھ جوڑ لیتی۔ اور سریندر ناتھ بھی تھک ہار کر الگ ہو جایا کرتا۔

انسان حادثوں کا مجموعہ ہے۔ حادثات انسان کو جنم دیتے ہیں اور حادثے سے ہی انسان ملتا اور بچھڑتا ہے۔ پریت کو بھی یہاں سے گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ آج کی رات بھی وہ سو نہ سکی تھی۔ صبح آکر جا چکی تھی۔ پلکیں بوجھل اور اور اندھیرے میں گم تھیں۔ وقت یہی ۹ بجے کا رہا ہوگا۔ آشا بستر پر کروٹ بدل رہی تھی۔ گیت دودھ کی بوتل سے کھیل رہا تھا۔ وہ چھ بجے سریندر ناتھ کے ساتھ ہی اٹھا تھا۔ دفتر گئے ہوئے سریندر ناتھ کو دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس دوران آشا نے کئی بار چادر سے سر نکال کر سامنے میز پر رکھی ہوئی پریت کی تصویر کو دیکھا۔

آنکھیں بھیگ کر سمندر بن چکی تھیں۔

بھیگی آنکھوں سے جب اس نے دیکھا کہ سورج کھڑکی سے اندر در آیا ہے تو یہ دیکھکر وہ حیران ہو اٹھی .... اور گیت کی معصوم نظریں کھیلتے کھیلتے تصویر کے گرد گھومتی ہوئی روشنی پر پڑی تو وہ بھی خوشی سے اپنے آپ کو اس طرف بڑھنے سے نہ روک سکا۔ آشا نے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ہاتھ بڑھنے سے پہلے ہی گیت کو پہنچنا تھا اور وہ پریت کی تصویر کے پاس پہنچ گیا۔ اس جیت پر گیت مسکرائے جا رہا تھا۔ اس وقت آشا کی بھیگی آنکھوں میں بھی روشنی بوند بوند پھیلی گئی تھی۔ اب وہ ایک ٹک کبھی سورج کو اور کبھی اس گیت کو جس سے وہ شدید نفرت کرتی تھی، دیکھنے لگی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب گیت کو دیکھنے کے بعد اس کی آنکھوں کی زرخیز زمین پر نفرت کی فصل نہیں اگ پائی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ گیت، پریت کی مسکراتی ہوئی تصویر دیکھ کر پاگل ہو اٹھا۔ بھائی۔! کہتا ہوا اس نے دودھ کی بوتل کو ایک سمت اچھال دیا۔ ہاتھ تصویر کی طرف بڑھایا، اٹھا اور چھوٹے چھوٹے مگر تیز پاؤں رکھتا ہوا سڑک تک پہنچ گیا۔

کار کی آواز سن کر آشا کی جان نکل گئی۔ چیخ سے اس کے پرخچے اڑ گئے۔ زوردار بریک کے ساتھ کار گیت کے پاس آکر رک گئی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر گیت تصویر لئے مسکرا رہا تھا۔

نوجوان نے اترتے ہی گیت کو اپنی گود میں اٹھالیا۔ آشا تو آدھی مری ہوئی تھی۔ ”میرا بچّہ۔ میرا بچّہ!“ ہانپتی کانپتی، چیختی اور چلاتی ہوئی وہ گیت کے پاس دوڑی ہوئی چلی آئی۔ گیت کے ہاتھ سے ایک ہی جست میں تصویر چھین کر سینے سے لگاتی ہوئی، پاگلوں کی طرح وہ پلٹی۔ پلٹتے پلٹتے رکنے کی کوشش کی۔ لڑکھڑائی اور پھر سنبھل گئی۔

”تم۔؟“ آشا کی آنکھیں سراپا سوال بن گئیں۔

”حادثے کا علم ہوا تو سوچا کہ تم سے مل لوں۔“

آشا کی بوند بوند آنکھوں میں روشنی اس طرح اتر آئی تھی جیسے سمندر کی سطح پر چاندنی بچھائی گئی ہو۔

”کیا ہوا تھا اسے۔؟“ سمیر سنجیدہ تھا۔

"ایک شام جب میں اسے کمرے میں ڈھونڈ چکی تو آنگن میں پہنچی، ایسا لگا کہ وہ چھت پر ہے۔ پھر ہلکی سے جھلک دکھائی دی۔ تب نہ جانے تم کہاں سے آگئے تھے۔ میں بھی سمیر کہہ کر اسے پہلی بار پکار بیٹھی تھی، اور وہ بھی میری آغوش میں آنے کے لئے اچانک جنون کی سرحد پار کر گیا تھا۔ پھر ہونا کیا تھا... بارش کا زمانہ تھا۔ پاؤں......" وہ بولتے بولتے رکی پھر سسکنے لگی۔

"اس تصویر کو دیکھ رہے ہو۔ کسی کو کھو کر اس طرح پالینا بڑی جیت ہے۔ یہ مجھے تمہارے علاوہ کون بتائے گا۔؟" سمیر کی آنکھیں اپنے بچپن کو اتنے پاس پاکر حیرت سے پھیل گئیں۔ اس وقت آشا کے چہرے پر تمازت کی چاندنی سے ایک نیا تاج محل جنم لے رہا تھا۔ جس کے سفید بدن پر محبت کی انوکھی کہانی لکھی تھی۔

"پہلے دنیا نے تمہیں مجھ سے صرف اس لئے چھین لیا کہ تم مسلم تھے۔ لیکن پریت تو میری کوکھ کا حصہ تھا..... اسے پاکر میں نے سارے غم بھلا دیئے تھے۔ آج وہ بھی نہیں رہا۔ ایک تم ہو اور وہ بھی اتنی دور کہ........"

آشا کو آج نے صدیوں کے بعد قربت سے سرفراز کیا تھا۔ اس لئے سرک کر وہ سمیر کے بالکل قریب آگئی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔؟"

"تم پریت بن کر میرے گھر آجاؤ یا سمیر بن کر مجھ سے ملتے رہو۔"

سمیر انجانے خوف سے کانپ اٹھا۔ کانپتی آنکھوں سے اس نے کلائی کو دیکھا اور کانپتے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

"میں جا رہا ہوں...."

آشا نے روکنا چاہا۔ لیکن کچھ سوچ کر بولی۔

"میں تمہیں روک تو نہیں سکتی، لیکن ایک بنتی تو کر ہی سکتی ہوں....."

سمیر نے پلٹے بغیر کہا۔ "کیا۔؟"

تمہارا یہ چہرہ اب میری زندگی بن چکا ہے۔ میری بے چین نظروں کی تسکین کے

لئے تمہیں.....ورنہ میں...'' آشا کی آواز گرداب میں الجھ کر رہ گئی تھی .وہ زاور قطار رونے لگی۔

ایک طرف آشا کی تشنہ محبت تھی تو دوسری طرف ایک گھر کی تباہ کاری کے ساتھ زمانے کا خوف بھی تھا۔وہ نظریں جھکائے گیت کی طرف بڑھتا رہا۔ آشا کانپ کر رہ گئی۔اس کی روح میں اتر جانے والا چہرہ اس کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے دور جا رہا تھا۔اس وقت آشا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا جوالا مکھی پھوٹ پڑا۔ جیسے وہ ننھی منی بچی ہو۔،جسے ضد کرنا اور بات منوانا خوب آتا ہو۔ آخری دم تک کوشش کرتی رہی۔

''بولو نا سمیر آؤ گے ناؤ؟

کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز دب کر رہ گئی۔ سمیر بغیر کوئی جواب دے اسے صدیوں کی نظر سے دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ کار کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

زندگی کے اس سفر میں آشا، سمیر کی آنکھوں میں نہیں بلکہ اپنی آنکھوں میں اسے رکھنا چاہتی تھی .اب دیکھ بھی نہیں پائے گی۔اب صرف اس کی حسرت بھری نگاہیں تھیں اور دور جاتی ہوئی کار۔ایک طرف دونوں کے درمیان کی دوری آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور دوسری طرف آشا سوچ رہی تھی.....

''اب یہ دوریاں کیسے سمٹیں گی۔؟''

''ماں۔!''

گیت ماں کو ڈھونڈتا ہوا کمرے سے نکلا اور چھوٹے چھوٹے پاؤں رکھتا ہوا آشا کے پاس پہنچ گیا۔ پریت کی موت کے بعد وہ کئی بار آشا کے قریب جانے کی کوشش کر چکا تھا۔ ہر بار اسے ڈانٹ ملی تھی۔اب جب کہ سمیر اس سے دور جا رہا تھا، گیت اس کے سامنے آ گیا تھا۔ آنچل کو کھینچتا ہوا ''ماں۔ماں'' کہہ رہا تھا۔

آشا گیت سے نفرت کرتی تھی۔ایسے وقت میں غصے سے پاگل ہو اٹھی۔اس وقت اس نے گیت کو جھٹک دینا چاہا۔اور پھر اس نے پوری طاقت سے گیت کو اپنے کاندھے سے اوپر اٹھا بھی لیا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔اس لئے کہ اس وقت اس کی نظر دور جاتی ہوئی کار پر ٹھہر

گئی تھی۔ اور وہ گیت جو آشا کی سرخ آنکھوں سے گھبرا کر ایک کونے میں دبک جایا کرتا تھا وہ آج بنا خوف کے مسکرائے جا رہا تھا، آشا کے اٹھے ہوئے ہاتھ اس اچانک تبدیلی سے رک گئے۔ جب کہ گیت کے ہاتھ متحرک تھے۔ وہ کار کی طرف نظریں کئے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اوپر نیچے کر کے سمیر کو بلا رہا تھا۔

"آ۔ آ۔ آ"

گیت کی اس حرکت پر آشا کی آنکھیں پھیل کر آسمان کی ہو گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس نے جس کے کومل جسم کو قدم قدم پر کچلا تھا اس کے لئے آج وہ اتنی بڑی قربانی دے گا۔

آج گیت نے آشا کو جب پہلی بار اپنے لئے مسکراتے ہوئے دیکھا تو اس کی بھی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اور زور زور سے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو ہلانے لگا۔

کار دور دھند میں گم ہوتی جا رہی تھی اور گیت اسے بلا رہا تھا اس وقت آشا پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ گیت سے بے حد نفرت کرتی تھی۔ لیکن اسے آج بے تحاشہ چومے جا رہی تھی۔ اور گیت کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو چومتے چومتے آشا نے ہونٹوں پہ صندل کی خوشبو کو محسوس کیا، تب وہ اپنے آپ میں بڑبڑانے لگی تھی۔

"تم جا رہے ہو، جاؤ....... مگر، کل لوٹ کر پھر آؤ گے۔ یہیں اور اسی جگہ۔ تب تم پریت کے بجائے گیت کے بارے میں پوچھو گے۔!"

☆☆☆

شناخت

دنیا کا عظیم چوراہا.........

لوگوں کا ہجوم ،میں اور ایک لاش۔ لاش کے چاروں طرف پھیلے ہوئے اجنبی چہرے۔ میری پھٹی اور خاموش، مگر سوالوں کا جواب ڈھونڈتی آنکھیں۔ زمین سے چمٹی، گونگی آنکھوں سے آسمان کو گھورتی ہوئی لاش اور میری چشم نم....

میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ہجوم کا جائزہ لیا۔ لوگوں کی بڑی، چھوٹی، کالی، بھوری، سیاہ چشمے اور گولڈن فریم میں سجنے والی ساری کی ساری آنکھیں، زمین و آسمان کے درمیان پھیلے ہوئے مختلف خانوں میں منقسم یہ چہرے، اس لاش کی شناخت میں جٹی ہوئے تھے۔

پھر اوروں کی طرح میں بھی اس پیچیدہ مسئلے کو سلجھانے کے چکر میں الجھتا ہی چلا گیا۔ الجھتے الجھتے شناخت کا یہ مسئلہ اس وقت سلجھتا ہوا نظر آیا، جب وقت کی تیز و تند ہواؤں نے لاش کے چہرے پہ پڑی اجنبیت کی دبیز چادر کو تار تار کر کے فضاؤں میں بکھیر دیا۔

وہ میری لاش تھی۔

میں نے خود کو پہچاننے میں نہ غلطی اور نہ ہی تاخیر۔ اس لئے میری آنکھوں میں شناخت کے جگنو یکایک جگمگا اٹھے۔

میرے چہرے مہرے اور رنگ روپ سے کسی نے میری شناخت کی تو کپڑوں پہ نظریں پڑتے ہی وہ اپنی آنکھیں موڑ کر فوراً اپنا راستہ ہو لیا۔ کپڑوں سے جب کسی کی آنکھوں میں شناخت کے دیپ جلے تو رنگ وروپ کے جھونکوں نے اسے بجھا دیا۔ بال تو عام سے تھے۔ اس طرح ہجوم کے بیچ بے شناخت ہو کر رہ گیا۔

"جب کسی کی شناخت دھندلکے میں گم ہو جاتی ہے تو تاریخ کے اوراق اس کے نام ونشان کو اپنے سینے سے کھرچ کر الگ کر دیتے ہیں۔" بھیڑ میں کسی نے میری ہی آواز میں مجھ سے سرگوشی کی۔

"تو کیا میری شناخت بھی تاریکی کے دھندلکے میں گم ہو چکی ہے۔؟"

"تو کیا میں سچ مچ مر چکا ہوں۔؟

"نہیں نہیں۔ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ یہ تو میری لاش ہے"۔

میں زار و قطار روتے روتے اپنی لاش کے قریب پہنچ گیا اور اس سے لپٹ گیا۔ اور گ میری ان حرکتوں کے باعث مجھے پاگل سمجھنے لگے۔

"باپ، بھائی یا پھر کوئی عزیز اس آدمی کا کسی حادثے میں ضرور مارا گیا ہوگا۔ اس لئے بے چارہ پاگل ہو کر اس لاش کو اپنی لاش سمجھ بیٹھا ہے۔

اور میں لوگوں کی باتوں سے بے نیاز اپنی لاش کو اپنے وجود سے چمٹائے تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا بھیڑ سے باہر نکل آیا۔ اور لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا قبرستان پہنچا۔ وہاں سناٹے دوڑ رہے تھے۔ میرے آگے۔ میرے پیچھے۔ دائیں اور بائیں۔ سناٹے ہی سناٹے۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ پراسرار سناٹے گھیر لینا چاہتے ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے چھین لیا چاہتے ہوں۔ خوف سے میرا وجود دہل گیا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ سناٹے اب میرے وجود پر وار کرنے والے ہیں تو میں نے ان کے نوکیلے پنجوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے خود کو اپنے اندر سمو لیا اور خود پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

ایک بوڑھے درخت کے سائے تلے بوڑھے گورکن کے ساتھ دو اور بوڑھے شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ جو میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ میں اپنی لاش کو چار پانچ گز کے فاصلے پر روک کر حیران و ششدر رہ گیا کہ اس وقت دونوں کے چہرے سے اجنبیت کی بو ٹپک ٹپک کر پوری فضا میں پھیل چکی تھی۔ جن میں شناسائیت کا لمس تک باقی نہیں رہا تھا۔

پھر میں گورکن سے مخاطب ہوا۔

"برادر...... دنیا کے عظیم چوراہے سے میں اپنی لاش اٹھا لایا ہوں، اسے اس قبرستان کے کسی کونے میں دفن کر دو۔"

لاش کے چہرے پہ گورکن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "یہ تم ہو۔؟"

"ہاں...... برادر"

"نہیں، یہ تم نہیں ہو سکتے۔۔ میں یہاں ہزاروں برس سے کئی کروڑ لوگوں کو دفن کر چکا ہوں۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ دیکھو اس کی شکل و صورت اور سیاہیوں سے بے نیاز چہرا...... کپڑے سے میں نہیں مان سکتا"۔

"نہیں برادر! مجھ پر بھروسہ کرو۔ یہ میں ہی ہوں............"

"بھروسہ۔!" گورگن کے ہونٹوں پر طنز کھیلنے لگا تھا۔ "آدم کو بھی اپنے بیٹوں پر بہت بھروسہ تھا برخوردار! لیکن کیا ہوا......؟ اور پھر بھروسے کی ریت تو اس دن سے ہی اٹھ چکی ہے جس دن قابیل نے ہابیل کو.......۔ اگر اب بھی تمہاری آنکھوں میں اُمید کی کرن جاگ رہی ہے تو جاؤ اور دھرتی کے کسی گوشے سے دو چار بھروسہ مند چہروں کو لے آؤ، جو تمہیں پہچانتے ہوں۔" گورکن یہ کہتا ہوا اُٹھا اور دونوں کے ساتھ قبروں کی پگڈنڈی سے ہوتا ہوا ایک سمت چلا گیا۔

میرے ہونٹ ہلے۔ لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک دوسرے پر جمتے ہی چپک گئے۔ شاید یہ وقت کا تقاضہ تھا۔ یا پھر فطرت کا حصہ کہ جب شناسا چہرے اجنبی بن جائیں تو شناسائی دکھانا بے وقوفی کی علامت ہے، اور میں ان علامتوں کے بوجھ تلے دب کر اور سسک سسک کر زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔

اس لئے میں آگے بڑھ گیا۔

شمشان گھاٹ۔۔

ندی کے کنارے کنارے چلتے ہوئے جب میں اس کے گیٹ کے اندر داخل ہوا تو کچھ دور جاکر کریا کرم کرنے والے پنڈت جی، سلگتی قبروں کے ڈھیر کے آگے منتر پڑھتے ہوئے مل گئے۔

"پنڈت جی۔!" میں اس طرح مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھا جیسے برسوں بعد معشوق سے ملن ہو رہا ہو۔

"ارے بھائی! یہاں کہاں آرہے ہو۔؟" انہوں نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"پنڈت جی! اب آپ ہی بتایئے کہ یہاں کوئی لاش کو لے کر بھلا کیوں آتا ہے۔؟" میری مسکراہٹ کچھ پھیکی پڑ گئی۔

"ہاں، ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ کس کی لاش ہے۔؟"

"میری ہے پنڈت جی۔؟"

"تمہاری...... ؟ لیکن اس کے سر کی چوٹی۔۔ جنیؤ اور ماتھے پر تلک کا نشان...... یہ سب کہاں ہیں۔۔؟"

پنڈت جی نے لاش کو الٹ پلٹ کر اچھی طرح سے دیکھنے کے بعد کہا۔

"سب کچھ ویسا ہی ہے پنڈت جی۔؟"

"کیسا۔؟"

"جیسا اس دھرتی پر بھگوان نے مجھے اتارا تھا۔ یہ سب کچھ تو یہاں کی چیز ہیں، ہماری آپ کی دی ہوئی نہیں......" میں نے اب سمجھانا چاہا تو وہ ناراض ہو گئے۔

"ہاں، ہاں، میں بھی پرلوک کی نہیں، یہیں کی بات کر رہا ہوں۔"

"لیکن وہ سب کچھ تو......" میں نے ہاتھ جوڑ کر ان کے پاؤں پکڑ لئے۔

"جاؤ! جب یہ سب کچھ تمہارے پاس ہو جائے تب آنا۔" پنڈت جی میری طرف سے منہ پھیرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

شمشان گھاٹ سے نکالا گیا میں، اور میری لاش، گرجا گھر جانے والی سڑک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کبھی تیز، اور کبھی آہستہ اور کبھی....

میں، میری لاش اور شناخت کا وہی مسئلہ۔!

"فادر۔!" سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ وہ لاس جو سیڑھیوں کے نیچے رکھی ہوئی ہے۔ وہ میری ہے۔ میں اپنے ہونے کا سرٹیفکیٹ لینا چاہتا ہوں۔ کہ اپنی لاش کو قبر میں اتارنے کے بعد اپنے ہی روبرو یہ کہنا نہ پڑ جائے کہ یہ میں ہی ہوں۔"

جنگل کا جنگل، سمندر کا سمندر ناکامیابیوں کا سفر کرتا ہوا.....

اور میرے اندر کا "میں" اسی طرح بدستور چیختا رہا۔

"فادر۔! میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرے اندر جھانکو اور دیکھو۔ کیا میری آنکھوں کی گہرائیوں میں یسوع مسیح کی لٹکتی ہوئی تصویریں نہیں ہیں۔؟ میرے سینے کو چیر کر اپنی آنکھیں میری دل پر گاڑ دو اور بتاؤ کہ کیا آپ کے سینے پہ لٹکے ہوئے صلیب جیسے نشان میرے دل کے اندر ثبت نہیں ہیں۔؟

میرے اندر کا میں چیختا رہا۔ لیکن اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری چیخ میں کوئی آواز ہی نہیں ہے۔ شاید آواز کو وقت کے گھنے جنگل نے نگل لیا تھا۔ یا پھر میرے اندر کا "میں" ہی نہیں چیخ رہا تھا۔ کیوں کہ میں تو مر چکا تھا۔

پھر میں اپنی لاش کو لے کر جنگل کی طرف بڑھ گیا......

سڑک سنسان اور دھند لکے میں لپٹی ہوئی تھی سڑک پہ میرے قدموں کے ساتھ ایک اور چاپ ابھر رہی تھی۔ میرے ساتھ سڑک بھی چل رہی تھی۔ اس سمت جس سمت میں چل رہا تھا۔ اس لئے جنگل اور میرے درمیان کی دوری جوں کی توں رہ گئی۔ میں وہیں کا وہیں تھا۔ صرف میرے قدم اٹھ رہے تھے۔ سڑک چل رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ میں چل رہا ہوں۔

شاید جنگل کو میرے بے شناخت ہونے کا علم ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ مجھ سے دور

بھاگ رہا تھا۔

میں اب کافی تھک چکا تھا۔ میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اس لئے اب سوائے لوٹنے کے میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں اب لوٹ رہا تھا۔

اور اب میں سڑک کی مخالف سمت چل رہا تھا۔ میں ایک قدم سڑک کی طرف بڑھاتا۔ سڑک میری طرف ایک قدم بڑھاتی۔ اور اس طرح ایک بار میں دو قدموں کا فاصلہ طے کر پانے میں سڑک میری معاون بنی۔

راستے بھر فکر کے سمندر میں سوالوں کے پتھر گرتے، گرداب بنتے اور بکھر جاتے یہ عمل کافی دیر تک چلتا رہا۔

پھر یکایک فضاؤں میں کئی سوالیہ نشان ابھرے۔

"کیا قابیل نے ہابیل کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔"؟

"کیا راون کو سیتا کی پوترتا کا علم نہیں تھا۔؟"

"کیا یزید، محمدؐ کے خاندان سے غافل تھا۔؟"

"کیا مسیح کو صلیب پر ہم نے نہیں لٹکایا تھا۔؟"

"کیا آج ہر موڑ پر ہزاروں روان، یدھشٹر، یزید اور قابیل مکھوٹا لگائے نہیں کھڑے ہیں۔؟"

کیا قبرستان کے گورکن، شمشان گھاٹ کے پنڈت، گرجا گھر کے پادری اور ان چہروں کو تم نے غور سے نہیں دیکھا جو سماج میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔

میری لاش نے مجھ سے اس طرح کے کئی ایک سوالات کیے اور جواب میں، میں اس کے سامنے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔

یکایک میرے قدم ایک سمت اٹھتے ہی چلے گئے۔ راستہ جانا پہچانا تھا۔ راستہ جب جانا پہچانا ہو تو فاصلے خود بخود سمٹ جاتے ہیں۔

اور آج میں دنیا کے اسی عظیم چوراہے پر پہنچ گیا ہوں، جہاں ہر رات وقت کا قتل

ہوتا ہے اور چوراہا سرخ سرخ لہو سے جل تھل ہو جاتا ہے۔ اور دن بھر کا سورج ہر روز اپنی چٹوری زبان سے سارے لہو کو چاٹ کر اپنی بھوک مٹاتا ہے۔

دنیا کا یہ عظیم چوراہا۔ اب اندھیرے میں پوری طرح ڈوب چکا ہے۔ میں نے اندھیرے میں اپنی اندھی آنکھیں ادھر ادھر دوڑائیں تو یہ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ لوگ تاریکی میں پوری طرح سیاہ ہو چکے ہیں۔ پھر ایک پل ضائع کئے بغیر میں نے اپنی لاش کو اپنے کندھے سے کھینچا اور اسی چوراہے پر اسی جگہ لٹا کر اس طرف دوڑتا چلا گیا، جدھر سے میں آیا تھا۔

☆☆☆

بابا کبوتر والا

ٹورنامنٹ سے ایک دن قبل بابا کبوتر والا میرے گھر آیا اور مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں اپنی مادہ کبوتر اس کے ہاتھوں فروخت کردوں۔ لیکن مجھے اس کے پرفارمینس پر پورا بھروسہ تا کہ موسم میں تھوڑی بہت بھی خنکی رہی اور آسمان صاف رہا تو چھ سات گھنٹے کا وقت تو وہ نکال ہی لے گی۔ ہر کسی کی نظریں بھی اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ بابا کبوتر والا کی اجارہ داری اس میدان میں دس سالوں سے چلی آرہی تھی۔ لیکن میری مادہ کبوتر کی اڑان کے باعث اس کے دل میں خطرے کی گھنٹی رک رک کر بجنے لگی تھی۔ ویسے تو وہ پہلے بھی کئی بار میرے یہاں آچکا تھا۔ لیکن میری شادی کے بعد آج وہ پہلی بار آیا تھا۔

"شاہ جی! سنا ہے کہ اس ٹورنامنٹ میں تم کوئی لکھنوی کبوتر اڑا رہے ہو۔" میری بیوی کے ہاتھوں سے چائے لیتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

میں نے چاندنی میں دھلی دھلائی بالکل سفید، کالی آنکھوں والی تارامکو مادہ کو پکڑ کر سامنے والی کرسی کے ہینڈل پر بٹھادیا۔

"پانچ چھ ماہ قبل آخری بار میں یہاں آیا تھا، تب تو یہ نہیں تھا۔؟"

”نہیں۔! میرے لکھنوی سسر کو میرے شوق کا علم تھا۔ اس لئے اسے بھی جہیز میں......“

”لکھنوی کبوتر کا بھائی کوئی جواب نہیں۔“ اس کے ان تعریفی کلمات پہ میری بیوی اندر ہی اندر مسکرا کر رہ گئی۔

”لیکن تم کیا اڑا رہے ہو۔؟“ میں نے پلٹ کر پوچھا۔

”اسے صرف ایک اتفاق سمجھئے کہ میں نے بھی اڑان کے لئے تارامکوا ہی تیار کیا ہے۔ لیکن بے چارہ بہت دنوں سے پھوٹ پڑا ہے۔ تمہاری اس مادہ کو دیکھتے ہی خیال آیا کہ اس کا جوڑا اس کے ساتھ ہنڈریڈ پر سینٹ فٹ بیٹھے گا۔ اسے تم مجھے دے دو۔ قیمت جو بولو۔“

”تم بھی تو بہت دنوں سے پھوٹ پڑے ہو۔ کب لا رہے ہو اپنے جوڑے کو۔؟“

”میں جس نسل کا کبوتر ہوں اس کا جوڑا جلدی ملتا نہیں۔“ پھر وہ میری بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ”بھابی جان! اگر آپ کو کہیں کوئی نظر آجائے تو بتا دیجئے گا۔ بندہ حاضر ہے۔“

بابا کبوتر والا کے جاتے ہی شہ زینہ نے مجھے آڑے ہاتھوں لے لیا۔ ”جب وہ اتنی ضد کر رہا ہے تو دے دیجئے۔ ابو جان سے کہہ کر میں دوسرا منگوا دوں گی۔“

”اور کل اسے وہ بھی پسند آگیا تو...... آج یہ تارامکوا مادہ ہی میری عزت کے پنکھ ہیں۔ بابا کبوتر والا میرے لمبے اور سنہرے پنکھ کاٹ کر سارے آسمان پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس بار دس سالوں سے چلی آرہی لمبی اور اونچی اڑان کی اس جنگ میں اس کی شکست یقین کی حدوں کو چھونے لگی ہے۔ وہ اپنی شکست اور بے عزتی سے بچنے کے لئے اونچی اڑان کے اس کبوتر کو مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔ سنا ہے کہ اس نے باز بھی پال رکھا ہے۔ ٹورنامنٹ جیتنے میں ہر بار باز نے اس کی مدد کی ہے۔ لیکن پرمان اب تک نہیں مل پایا ہے کہ اس نے ہی باز کو......

”تمہیں کس نے منع کیا ہے باز پالنے سے......؟“

”میں دھوکے کے پنکھ لگا کر آسمان میں اپنی فتح کا پرچم نہیں گاڑنا چاہتا۔“

"لیکن آسمانی جنگ میں آج سب جائز ہے۔ بابا کبوتر والا میری نظر میں کچھ بھی غلط نہیں کر رہا ہے۔ وہ وقت کا نباض ہے۔ تمہیں اس سے یہ ہنر چرانا چاہئے۔" شبہ زینہ نے دبے لفظوں میں بابا کبوتر والا کی طرف داری کر کے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی میں نہ تو دھوکے کے پنکھ لگا پایا اور نہ ہی باز کو پالتو بنانے کا ہنر ہی سیکھ سکا۔

ایک دن جب میں دفتر سے گھر لوٹا تو آنگن میں ایک کبوتر کو خون میں لت پت پایا۔ اس کا ڈائینا باز کی مار سے بری طرح زخمی تھا۔ میں نے اس کی مرہم پٹی کی اور وہ کچھ ہی دنوں میں ٹھیک ہو گیا۔ پھر میں اس کی تنہائی کا ساتھی ڈھونڈنے کبوتر بازار پہنچا۔ وہاں ایک کونے میں ایک شخص چار پانچ پر بندھے ہوئے کبوتروں کو اپنی موٹر سائیکل کے ہینڈل پر بٹھائے، دونوں طرف ٹانگیں کیے بیٹھا تھا۔ لمبا چھریرا جسم، گورا رنگ، لمبوترہ چہرہ جس پر چیچک کے چھوٹے چھوٹے داغ، باز جیسی چمکتی آنکھیں لمبی اور آگے کی طرف جھکی ہوئی ناک، گلے میں سونے کی چین جس پر لٹکتا ہوا کبوتر نما لاکٹ، گھنگھریالے الجھے بال اور لمبے لمبے ناخن۔ میں نے اس سے اپنے نر کے لئے ایک مادہ خریدا۔ یہ بابا کبوتر والے کے ساتھ چار سال قبل ہوئی میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد کبوتروں کے ساتھ میں بھی کبوتر بن گیا۔ اتوار ہوتے ہی سارے کام دھام چھوڑ کر میں اڑتا ہوا بازار پہنچ جاتا۔ وہاں پرانے اور نئے کبوتر بازوں سے ملتا۔ ان سے میل جول بڑھاتا۔ ان کی ڈینگیں سنتا۔ مجھ پر ایک نشہ سا چھا جاتا۔ خوب مزا آتا۔

کبوتروں کے رہنے کے لئے کابک میں نے خود تیار کیا۔ بلی کے پنجوں سے محفوظ رکھنے کے لیئے دروازے لگا کر دو کیلوں کے سہارے برآمدے کے سامنے چھجے کے نیچے اسے ٹانگ دیا۔ اور اس کے بیٹھنے کے لئے بانس کی کھپچیوں کی مدد سے چھتری بنا کر اسے آنگن کے ایک کونے میں کافی اونچائی پہ گاڑ دیا۔ صبح سے شام تک میں غٹر غوں، غٹر غوں کی آوازیں سنتا رہتا۔ جب بھی کلسیرہ نر غٹر غوں، غٹر غوں کرتے ہوئے اپنے جسم کو پھلاتا اور اپنی گردن موٹی کر کے گول گول گھومتے ہوئے اپنی دم کو پھیلاتا اور اسے رگڑتے ہوئے جب غوں غوں کر کے اپنی پھولی ہوئی گردن نیچے سے اوپر اٹھاتا تو کلسیرہ مادہ اپنے پروں کو پھلا کر تھوڑی

موٹی ہو جاتی۔ کچھ دور تک وہ جھوم جھوم کر چلتی رہتی۔ پھر نر کے ساتھ چونچ میں چونچ ملاتے ہوئے وہ جھٹ سے اس کے آگے بیٹھ جاتی...... پھر دونوں پھڑ پھڑا کر اڑتے اور ایک دو چکر لگانے کے بعد چھتری پہ آکر بیٹھ جاتے۔

جب کبوتر کابک میں تنکے جمع کرنے لگے تو ایک Gynocologist کی بھومیکا نبھاتے ہوئے میں نے مادہ کا چیک اپ کیا۔ اس کے پیٹ کے نیچے کے دونوں کانٹے اپنی جگہ سے تھوڑا ہٹ جانے کی وجہ سے میری انگلی اس کے بیچ آرام سے دھنس گئی۔ اس دن میں بہت خوش تھا۔

پہلے دن سے لے کر اکیسویں دن تک دونوں باری باری سے انڈے کو سیتے رہے۔ بائیسویں صبح کابک کا دروازہ کھلتے ہی دونوں پھڑ پھڑ کرتے ہوئے چھتری پہ چلے گئے۔ میں نے کرسی کی مدد سے کابک کے اندر جھانکا۔ جگہ جگہ سے انڈے ہلکے کریک کر گئے تھے جیسے بھر بھری اور گیلی مٹی کے اندر سے ابھی ابھی کیڑا رینگ گیا ہو۔ دو پہر ہوتے ہوتے ہلکے گلابی گوشت پوست کے دو لوتھڑے چوں چوں کرنے لگے اور ہر چوں چوں پر باری باری سے نر اور مادہ چونچ میں چونچ ڈال کر اسے دانے کھلاتے رہے۔ ایک دو ماہ کے بعد یہ پٹھے بڑے ہو گئے۔ پھر بازوؤں کے پرانے پنکھ جھڑنے لگے۔ نئی کلیاں نکلنے لگیں۔ ایک سے دس تک کی گنتی دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئی۔ پھر اس نے بھی انڈے دئے۔ کبوتر۔ انڈے۔ انڈے۔ کبوتر۔ اور سال دو سال کے اندر پورا گھر کبوتروں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ کلیسرہ، پھلیسرہ، للسیرہ، تارا ملوا، ہرا، جگ، چینا، کل دمہ، گروا، گولا، لوٹن، لقا اور...... اور ان ہی کبوتروں میں سے کچھ کے پاؤں میں کڑے تھے تو کچھ نے اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھ رکھے تھے۔ کچھ کے ڈائینے کے اندرونی حصے رنگے ہوئے تھے تو کچھ نے پنکھ باندھ رکھے تھے۔ کچھ کے پر کاٹے گئے تھے تو کچھ کے پر جالی دار تھے۔

اب راتوں رات میرا شمار شہر کے کبوتر بازوں میں ہونے لگا۔ صبح سے شام تک میرے یہاں کبوتر پریمیوں کی بھیڑ ہوتی۔ کچھ کبوتر خریدنے آتے تو کچھ اڑان دیکھ کر محظوظ ہوتے اور کچھ اس طرح کے دلچسپ سوالات کرتے کہ جواب دیتے ہوئے مزا آجاتا۔

ڈیوٹی کے بعد میرا سارا وقت کٹھل کے پیڑ کی چھاؤں میں گذرتا۔ وہاں سے بیٹھے بیٹھے میں کبوتروں کی اڑان دیکھا کرتا۔ بادل بند ہوتے وقت میری آنکھیں آسمان سے چپک جاتیں۔ اس کے اڑنے اور اترنے کے ٹائم کو کاپی میں نوٹ کرتا۔ ہر روز کبوتروں کو گننا۔ ڈربے صاف کرنا۔ گندے پنکھوں کو اکھاڑنا۔ مادہ کو پکڑ کر نر کو للچانا اور اپنے ہاتھوں میں بلا کر اس سے غٹر غوں کے نغمے سننا۔ مادہ کا پھول جانا اور نر کا دم رگڑنا۔ ان سب چیزوں کے امتزاج سے ہی جیسے ہی میری زندگی کی تشکیل ہوئی تھی۔

ایک سال قبل جب میں دفتر کے کام سے لکھنو گیا تو چچا کے یہاں ایک دن قیام کیا۔ کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور غٹر غوں کی آواز سے میری آنکھ صبح بہت جلدی کھل گئی۔ تب میں نے سوچا چل کر باہر کبوتر بازی کا رعب جمایا جائے۔ لیکن میں جیسے ہی آنگن میں پہنچا تو خود کو حیرت زدہ پایا گلابی شلوار قمیص میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ کبوتروں کو دانے چھینٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہاتھ رک گئے۔ مٹھی بند ہو گئی۔ شمعی انگلیوں میں کچھ دیر ارتعاش رہا۔ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے سارے دانے پھینک کر آدھے دوپٹے کو سنبھالے شرماتے ہوئے میرے سامنے سے ایسے گذر گئی جیسے ......

ناشتے کی ٹیبل پہ میں نے اسے ایک بار پھر دیکھا۔ وہ نہا دھو کر سفید شلوار سوٹ میں ناشتہ نکال رہی تھی۔ چچا نے بتایا کے تمہارے والدین کو اللہ جنت نصیب کرے۔ بہت چڑی تھی انہیں کبوتروں کی گندگی سے۔ تم مجھ پہ گئے ہو۔ اس بڑھاپے میں مجھ سے زیادہ کبوتروں کی دیکھ بھال شہہ زینہ کرتی ہے۔" اس وقت میری چور آنکھیں شہ زینہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی میری طرف نظریں بچا کر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت ایسا لگا کہ جیسے میری زندگی کی اونچی اڑان کے لئے مجھے اس سے اچھی کبوتری نہیں مل سکتی۔ بالکل سفید۔ تارا کی مانند۔

شہ زینہ نے میرے دل کے آنگن میں قدم رکھتے ہی کابک کی چابیاں سنبھال لیں۔ مجھے اپنی پسند پہ ناز تھا۔ وہ گھر میں ہر آنے جانے والے کا مجھ سے زیادہ خیال رکھتی۔ ٹورنامنٹ میں حصہ لینے کے لئے اس نے ہی مجھے اکسایا تھا۔ اڑان کے لئے تارا کو مادہ کا انتخاب

بھی اس کا کیا ہوا تھا۔ وہ مجھے بابا کبوتر والا کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ چاہتی تھی کہ سارے آسمان پر اب میرا قبضہ ہو۔ اور وہ بھی میرے ساتھ آسمان کی اونچائیوں پر......

میں نے تارا کو مادہ کی اڑان پر ابھی کچھ ہی دن دھیان دیا تھا کہ وہ میرے دھیان کا کیندر بنتی ہی چلی گئی۔ دو تین گھنٹے اڑنے والے کبوتر میرے پاس پہلے ہی سے تھے۔ جب تارامکوا اپنے ساتھی کبوتر کے ساتھ نیچے اترنے لگتی تو میں دوسرا کبوتر اڑا دیتا۔ چھوٹے چھوٹے چکر کاٹتا ہوا اب وہ اوپر اٹھتا اور تارامکوا مادہ سے مل جاتا تو ایک بار پھر وہ دوسرے ساتھی کبوتر کے ساتھ آسمان کی اونچائیوں کو اپنے پروں پہ جھکانے کے لئے تازہ دم ہو جاتی۔ ٹورنامنٹ سے دس پندرہ دن پہلے سے اس نے چھ سات گھنٹہ ٹائم دینا شروع کر دیا تھا۔ بچے ہوئے وقت میں اضافے کی گنجائش ابھی باقی تھی کہ شبابی اڑان کا جوش اس کے بازوؤں کے ایک ایک پنکھ میں کروٹیں لے رہا تھا۔

ٹورنامنٹ میں کل دس کبوتر بازوں نے حصّہ لیا۔ مجھے چھوڑ کر سارے لوگ پرانے تھے۔ ٹورنامنٹ کے اصول و ضابطے کے مطابق نئے انٹری لینے والے کو سب سے پہلے اور دفاع کرنے والے کو سب سے آخر میں موقع دیا جاتا تھا۔

ٹورنامنٹ کے پہلے ہی دن قریب ساڑھے پانچ بجے صبح سارے لوگ میرے گھر آدھمکے۔ ٹھیک چھ بجے تارامکوا مادہ کے پاؤں میں شناختی دھاگا باندھنے کے بعد میں نے اسے پوری طاقت سے آسمان کی طرف اچھال دیا۔ چھوٹے چھوٹے دائرے بناتی۔ پلٹی پر پلٹی کھاتی وہ ہماری آنکھوں سے کچھ ہی دیر میں او جھل ہو گئی۔ قریب ڈھائی گھنٹہ بادل بند کے بعد بابا کبوتر والا کی باز جیسی تیز آنکھوں نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ وہ آسمان کی طرف ہاتھ کئے انگلی کے اشارے سے ہم سبھوں کو دکھاتا رہا۔ لیکن .... آخر کار میری بیوی کو کامیابی نصیب ہوئی۔ وہ بابا کبوتر والا کی انگلیوں سے بنی اشارے کی سیڑھی کے سہارے جلد ہی بادلوں کے نگر میں پردیش کر گئی۔ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے اور دکھاتے رہے۔ ہم سب دونوں کی تیز آنکھوں پہ حیران ہوئے... پھر ایک گھنٹہ کی مسلسل جدو جہد کے بعد سیاہ بادلو ں کے بیچ جھلمل جھلمل کرتے ہوئے تارا کو ہم نے بھی ڈھونڈ لیا۔

چائے پانی اور ناشتے کا دور چلتا رہا۔ وقت گذرتا رہا۔ اور ایک ڈر سر ابھارتا رہا کہ کہیں باز...... ؟ لیکن بابا کبوتر والے نے سب کے سامنے کھل کر کہا۔

"بزدل کبوتر ہی باز کی گرفت میں آتے ہیں۔ دس سال میں اس کا ایک بھی کبوتر باز کا لقمہ نہیں بنا ہے۔ اور آج موسم بھی بالکل صاف ہے۔ اس لئے باز............"

بابا کبوتر والا کی بات سچ ثابت ہوئی۔ تارا کو ا مادہ ۶ گھنٹہ بارہ منٹ کی لمبی اڑان کے بعد صحیح سلامت چھتری پہ لوٹ آئی۔ اس وقت سب کی حیران آنکھیں بابا کبوتر والے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اور بابا کبوتر والا کی چمکتی آنکھیں چھتری سے الجھی ہوئی تھیں۔

دوسرے۔ تیسرے۔ پانچویں۔ اور لگاتار نویں دن تک آسمان میں کئی ایک کبوتروں نے اپنی قوت پرواز کا مظاہرہ کیا۔ لیکن کوئی بھی پانچ کے نمبر سے اوپر اڑان کی سوئی نہیں لے جاسکا۔ اب سب کی نظریں بابا کبوتر والے پر ٹکی تھیں۔ جب کہ پچھلے ریکارڈ سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اس بار...... لیکن شیطانی دماغ سے سب خوف کھائے بیٹھے تھے۔

دسواں اور آخری دن۔ ہم سب ساڑھے پانچ بجے کے قریب بابا کبوتر والا کے گھر پہنچے۔ وہ برآمدے کے باہر کرسیاں لگائے اداس بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔ تارا کو نر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ آٹھ دس دنوں سے وہ نہ ٹھیک سے کچھ کھاتا تھا اور نہ ہی...... دو تین دنوں سے تو وہ گھر کے دو چار چکر لگا کر چھتری پر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ میرے کافی ہش ہش کرنے کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ آج صبح کابک کا دروازہ کھولتے ہی وہ ہمیشہ کی طرح چھتری پہ جا کر بیٹھ گیا۔ میرے دانہ دینے سے پہلے نہ جانے وہ اڑ کر کہاں چلا گیا۔ کافی دنوں سے پھوٹ تھا۔ لگتا ہے کسی مادہ کے چکر میں........ اس نے اپنے آنسوؤں پہ قابو پاتے ہوئے مجھے اپنے گلے سے لگالیا۔ شاہ جی! تمہیں میری طرف سے ٹورنامنٹ جیتنے پر بہت بہت مبارک باد۔"

طے شدہ پروگرام کے مطابق دوسرے دن ایک چھوٹے سے ہال میں جہاں شہر کے چھوٹے بڑے پچاسوں کبوتر باز موجود تھے وہیں مصروفیت کے باعث کچھ لوگ شریک نہیں ہو پائے۔ ان میں بابا کبوتر والا کی کمی مجھے سب سے زیادہ کھل رہی تھی۔

پانچ ہزار کے انعامی چیک اور کبوتر بنے شیلڈ کے ساتھ میں نے اپنی کھٹارا موپیڈ
گاڑی جیسے ہی گھر کے پاس روکی، ہمیشہ کی طرح میری نگاہ چھتری کی طرف اٹھ گئی۔ یکایک
آنکھوں کی پتلی سفید ہو گئی اور سامنے گھنا اندھیرا پھیل گیا۔

میری تارامکوا مادہ کسی دوسرے تارامکوانر کے ساتھ چونچ میں چونچ ملا رہی تھی۔

اس کے آگے میں اور کچھ بھی نہیں دیکھ سکا۔

☆☆☆

بیوٹی پالر میں کھڑی ایک لڑکی

"یہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں کہ جب ساری دنیا بیوٹی فیکیشن کے پیچھے مر رہی ہے تو ایسے میں اگر میں اپنی کوکھ کا بیوٹی فیکیشن کروالوں تو اس میں کیا برائی ہے۔؟"

"کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئی۔؟"

"ذرا سوچو! کل ہم دو سے تین ہو جائیں گے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔؟

"کل ہو کر پڑ سکتا ہے۔"

"وہ کیسے۔؟"

"رنگ اور نسل دونوں کا۔ اور یہی ہمارے لئے مستقبل کا سب سے بڑا سر درد ہوگا اس لئے سوچتی ہوں کہ وقت سے پہلے سب کچھ صاف صاف بتادوں۔ کیوں کہ ہماری نسل سے ہی ہماری پہچان باقی رہے گی۔"

"لیکن تم چاہتی ہو کیا۔؟"

"بستر پر تم ساتھ رہو۔ لیکن کوکھ میں ...."

آخر کیوں۔؟"

"تمہاری طرح اگر میرے بچے بھی سیاہ فام ہو گئے تو کل اُن کا مستقبل کیا ہو گا۔؟اس کے بارے میں تم مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہو۔اس لئے کہ تم اس رہگذر سے گذر چکے ہو۔ سارے پرابلمس کو جھیل چکے ہو۔کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے بچے بھی تمہاری طرح اونچی کرسیوں اور عہدے کی بھوک میں اپنی ساری زندگی فٹ پاتھ پر گذار دیں۔؟"

"تو پھر کیا تم بچے کو جنم دے کر دودھ میں نہلاؤ گی۔؟"

"ہاں۔لیکن وہ دودھ.........."

"تو اس کا مطلب ہے کہ تم کسی دوسرے کے ساتھ.........."

"نہیں!میں ایسا نہیں کروں گی۔"

"تو پھر کیا آسمان سے سیدھے کوئی تمہاری کوکھ میں......"

"نہیں۔!میرا مطلب ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے ہے۔ سمجھے۔!"

☆

میری روز کا تعلق ایک جنگجو گھرانے سے تھا اس کا باپ وہائٹ ہارس کے نام سے ایک خفیہ ایسوسی ایشن چلایا کرتا تھا۔اس کے ہزاروں ہزار ممبر ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ جنھیں اس بات کی ٹریننگ دی گئی تھی کہ سیاہ فام لوگوں کو ہر محاذ پر اتنا ستایا جائے کہ وہ زندگی سے بے زار ہو کر اپنی موت آپ مر جائیں۔سیاہ فامیوں پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ اس سے ہمارا گوڈ خوش نہیں ہے۔اس لئے اسے آسمان سے نکالتے وقت آگ کی بھٹی میں ڈال دیا گیا تاکہ دھرتی پہ ہم اسے پہچان سکیں اور سزا دے سکیں۔ سزا غلامی ہے۔یہ غلام ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ آزادی کا خواب دیکھنے والوں کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر دی جائیں گی۔"

میری اس ایسوسی ایشن کی سرگرم رکن تھی۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح سیاہ فامیوں کی دشمن تھی۔ سر اٹھانے والے سیاہ فامیوں کا وہ سرے سے صفایا کر دینا چاہتی تھی۔ اس کے لئے وہ وہ بارہا منصوبے بناتی۔ منصوبے بنتے اور بگڑتے رہے تھے۔اس لئے ادھر اس کی بے چینی میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا کہ اچانک ایک دن وہ کچھ سوچتے سوچتے خوشی سے

اچھل پڑی۔ اس لئے کہ اس بار اس کا منصوبہ ہی کچھ اور تھا۔

اپنے اس نئے منصوبے کے تحت دوسرے ہی دن وہ اپنے ڈیڈ سے مل کر وہائٹ ہاؤس ایسو سی ایشن کے صدر کے گھر پہنچی۔ البرٹ نارمن نے میری روز کے ہمراہ ڈیلی گیشن میں آئی ہوئی تمام لڑکیوں کا شاندار استقبال کیا۔

باتوں کا آخری دور دونوں فریقین کے لئے کافی اہم رہا۔

"البرٹ نارمن سے مجھے ایسی امید قطعی نہیں تھی۔"

"بات صرف اتنی ہے میری جی! کہ ہم لڑنیوالے نہیں ہیں۔ اگر ہمارا حق مل جائے تو پھر یہ لڑائی......"

"رنگ اور نسل کے فرق سے کیا ہوتا ہے۔ حقیقت میں ہم سب تو......"

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب پہل آپ کی طرف سے ہوئی ہے تو آخری دم تک شانتی کے اس پرچم کو اپنے ہاتھوں سے کبھی گرنے نہیں دوں گا۔"

رنگ و نسل کی یہ لڑائی یہاں آکر تھم گئی۔ لیکن منصوبہ بند طریقے سے لڑائی اس کے بعد بھی پہلے کی طرح ہی جاری رہی۔ میری کو جب بھی موقع ملتا۔ بلیک ہارس ایسوایشن کے دفتر پہنچ جاتی۔ گھنٹوں البرٹ نارمن سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی۔ کبھی باتوں کی دنیا میں ایک شرابی کی طرح بہک جاتی تو کبھی سنبھل سنبھل کر ایک رہنما کی طرح باتوں کی میٹھی سڑک پر چلنے لگتی۔ اور اس درمیان وہ محبت کا رس لفظ لفظ کر کے ایک شاطر کی طرح اس کے کانوں میں ٹپکاتی رہتی۔ اور البرٹ نارمن مدہوش پہ مدہوش ہوتا رہتا۔ عالم مدہوشی میں ایک دن وہ پوری طرح سے جھوم رہا تھا۔

"تم بہت اچھی ہو میری۔!"

"میں! وہ کیسے۔؟" میری ہنسنے لگتی ہے۔

"جب سارے گورے نفرت کرنے لگے تو محبت کا چاند بن کر تم نے ہمارے دل کے آسمان پہ جنم لیا اور ...." اور بڑھ کر البرٹ نارمن نے میری روز کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے آہستہ سے دبا دیا۔

"محبت کا ارتھ جانتے ہو۔؟" ادائے دلبری سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے میری سراپا محبت بن کر البرٹ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"بھلا یہ کون نہیں جانتا ہے۔؟" البرٹ مسکراتی آنکھوں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیتا ہے۔

"اور شادی۔؟" وہ اٹھلاتی ہے۔

"محبت کی اگلی منزل.........." البرٹ نارمن کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔

پھر دونوں منزل سے اگلی منزل کی طرف کچھ اس تیزی کے ساتھ بڑھے کہ رنگ و نسل کی دنیا محو حیرت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

☆

دونوں کے درمیان ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق کافی لمبی چوڑی بحثیں ہوئیں۔ البرٹ نارمن پہلے تو کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ لیکن میری جب بار بار اپنی باتوں کے محور پر نسل کی خوشحالی کو گھما گھما کر اسے سمجھانے کی کافی کوشش کرتی ہے اور آخر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ تب البرٹ نارمن اچانک خود کو بھٹی میں چڑھے ہوئے لوہے کی طرح محسوس کرتا ہے اور آہستہ آہستہ پگھلتا ہوا اپنے آپ کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا بھی رہتا ہے۔

"اگر تم سمجھتی ہو کہ ہمارے بچے کا مستقبل اسی میں ہے تو میں ......۔"

ہسپتال کا ایئر کنڈیشن کمرہ جو پوری طرح سے شیشے کا بنا ہوا ہے۔ البرٹ نارمن ہسپتال کے سینئر ڈاکٹر کے ہمراہ ٹیسٹ ٹیوب کے متعلق جہاں سنجیدگی کے ساتھ بات چیت کرنے میں مصروف ہے۔ وہیں میری دنیا و مافیہا سے بے خبر کیٹ لاگ دیکھنے میں منہمک ہے۔ اس کے ہر صفحہ پر بے شمار خوبصورت اور اسمارٹ مردوں کی تصویریں ہیں۔ جس کا مکمل بایوڈاٹا بھی اس میں درج ہے۔ صفحہ بر صفحہ وہ پلٹتی جاتی ہے۔ چہرے پہ چہرہ بدلتا جاتا ہے۔ ایک ایک کر کے اس کے سامنے خوبصورت اور دلکش چہرے گھومتے رہتے ہیں۔ اچانک ایک چوڑے چکلے سینے اور بھوری آنکھوں والے لمبے چھریرے قد کے نوجوان پر نظر پڑتے

ہی وہ یکا یک لڑکھڑا جاتی ہے۔ پھر سنبھل کر کوکھ کی نظروں سے بائیوڈاٹا کو پڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسکے بعد ایک بار پھر وہ اپنی متلاشی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیتی ہے۔ دفعتاً اس کی کوکھ کی دیوار میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ جیسے کوئی کیڑا رینگ رہا ہو۔ جیسے .... پھر وہ شناختی کارڈ ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے چہک اٹھتی ہے۔

"میرا چوائس کیسا ہے ڈاکٹر۔؟"

ڈاکٹر البرٹ نارمن کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتا ہے۔

"بہت خوب۔"

پھر اسی ہسپتال میں اس سے متعلق بہت سارے ٹیسٹ سینئر ڈاکٹر کی نگرانی میں لئے جاتے ہیں۔ ساری رکاوٹوں اور پریشانیوں کو ڈاکٹر اپنی محنت و لگن کے سہارے اس کی خواہش کے عین موافق بنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اور اب میری کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آنگن میں پسند کا پھول کھل کر ہی رہے گا تو اس کی خوشی ہواؤں کا زینہ طے کرتی ہوئی آسمان کی بلندیوں کو چھونے کے لئے بے تاب نظر آتی ہے۔ دوسری طرف البرٹ نارمن کے چہرے پہ اداسی کی ہلکی سی ایک پرت جمی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے اندر سے کہیں کہیں خوشیاں بھی جھانک رہی ہیں۔ اور وہیں کہیں سوچ کی آڑی ترچھی لکیریں بھی کھینچی ہوئی ہیں، جو کبھی کبھی چہرے کے اتار چڑھاؤ کے باعث آئینے میں بال کی مانند دکھائی پڑ جاتی ہیں۔

"کیا سوچ رہے ہو۔؟"

"سوچ رہا ہوں کہ جس بچے کو تم جنم دو گی وہ مجھے باپ کہے گا یا نہیں۔؟"

"کیوں نہیں کہے گا۔ اور بھلا اسے پتا ہی کیسے چلے گا کہ یہ سب کچھ ......"

"لیکن مجھے تو پتہ ہے۔ پھر کیا میں اسے اپنا بیٹا تسلیم کر پاؤں گا۔ جس میں میرے خون کا ایک بھی قطرہ نہیں، اسے اگر بیٹا مان بھی لوں تو کیا اس شخص کو جس کا خون اس بچے کی رگ رگ میں دوڑ رہا ہو گا تم اسے اپنا پتی سویکار کر و گی۔"

"پتی کی حیثیت سے تو دنیا تمہیں جانتی ہے۔"

"لیکن اگر اس شخص کو معلوم ہو گیا کہ تم اس کے بچے کی ماں بننے والی ہو تو وہ کس

رشتے کی نظر سے تمہیں دیکھے گا۔؟"

"یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔"

"لیکن تم، اپنے اور اپنے بچے کے بارے میں تو بتا سکتی ہو۔ کیا نام دو گی اس کو۔ میرا مطلب ہے باپ کی جگہ۔ میرا یا اس کا۔؟"

"تمہارا۔"

"لیکن میں اس بچے کا باپ نہیں ہوں۔"

لیکن تمہاری ہی بیوی اس بچے کی ماں ہے۔"

"اس طرح کرنا تو بچے کے ساتھ سراسر ناانصافی ہو گی۔ بیٹا کسی کا اور نام......"

"چوں کہ ہم سب مل کر دنیا کا بیوٹی فیکشن کر رہے ہیں۔ اس لئے نام اور کام میں کیا رکھا ہے۔"

"کیا تم ایسا سوچتی ہو کہ ایک اکیلی عورت کے یہ سب کچھ کرنے سے دنیا بیوٹی فائی ہو جائے گی۔؟"

"پہلے اس دنیا میں صرف آدم آئے۔ اس کے بعد دنیا خود بخود آگے بڑھ گئی۔

"لیکن یہ کہتے ہوئے وہ البرٹ سے اس بات کو سرے سے چھپا لیتی ہے کہ اس کی ایسوایشن کی بہت ساری لڑکیاں اس کی طرح ہی شادی رچا کر............

چاند آہستہ آہستہ اپنا سفر پورا کر رہا ہے۔ چودھویں کی رات آنے میں کچھ وقت ہے۔ لیکن اس کے باوجود تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں۔ اس تیاری میں میری جس جوش و ولولے کے ساتھ شامل ہے کچھ ویسا ہی جوش خروش البرٹ نارمن کے اندر بھی مچل رہا ہے جس کا ثبوت کپڑے کی خریداری ہے۔ اس دن بازار سے لوٹتے ہوئے البرٹ نارمن پوری طرح سے مذاق کے موڈ میں تھا۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ تمہیں سفید پسند ہے۔ رستم نے بچے کے دونوں کپڑے کا رنگ سفید ہی چنا ہے۔ لیکن ایک چیز جو میں نے مارک کیا ہے کہ سب میں ڈیزائن کالے کا ہی ہے پھر جب کہ تم ہر کالی چیز سے نفرت کرتی ہو تو ایسے میں تم نے اپنے بچے کے لئے اسے کیسے

پسند کر لیا۔؟"

"بدھو کہیں کے۔ اتنا بھی نہیں جانتے ہو کہ گورے بچوں پر وہائٹ اور بلیک کے کمبینیشن (COMBINATION) سے بنے کپڑے بہت کھلتے ہیں۔" میری اپنے گورے چہرے کے قریب کپڑے کو لاتے ہوئے مسکراتی ہے۔

"اور کالے بچوں پر ....؟" البرٹ نارمن اس کے ہاتھ سے کپڑا جھٹک لیتا ہے اور اپنے کالے ہاتھوں پہ اسے رکھ کر میری کی رائے جاننا چاہتا ہے۔

"وہ جوان کی مائیں ہیں وہ جانیں۔"

"کالے بچوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہو گانا۔"؟ البرٹ مسکراتا ہے۔

"ہو گا تو ہو گا۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔" میری اٹھ کر دوسرے کمرے میں جانے لگتی ہے۔

"جاننا چاہئے ایک ایسی عورت کو جس کے شوہر کا رنگ سیاہ ہے۔" البرٹ ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے بٹھا لیتا ہے۔ "لیکن تمہارے رنگ روپ سے میری کوکھ کے اس بچے کا کیا تعلق۔؟ میری ہاتھ ہوا میں تیرتا ہوا ٹھیک اس کے ناف کے اوپر آکر ٹھہر جاتا ہے۔"

"لگتا ہے کہ تم نے اس افریقی عورت کا قصہ نہیں سنا ہے۔ جس کا شوہر بھی سفید نسل کا ہے، لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ اسکے جڑواں بچے میں سے ایک نیگرو ہے۔"

"وہ کیسے۔"

"جیسے کالے رنگ کے ڈبے میں تھوڑا سا سفید رنگ پڑ جائے تو کالا رنگ اسے اپنے ساتھ اس طرح ملا لیتا ہے کہ سفید کا نام و نشان مٹ جاتا ہے، لیکن اگر سفید میں ایک بوند کالا ڈال دیا جائے تو وہ پھیل کر بھی کہیں نہ کہیں باقی رہ ہی جاتا ہے۔ جانتی ہو ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بلیک کلر ہمیشہ ڈومینیٹ (DOMINANT) کلر رہا ہے۔

"لیکن یہ میری کوکھ ہے۔ رنگ کا ڈبہ نہیں....." میری کے لہجے میں کٹیلا پن تھا۔

"ویسے تمہاری کوکھ بھی زندگی کے رنگ کا ایک سفید ڈبہ ہی ہے۔ لیکن اگر غلطی سے تھوڑا سا بھی کالا رنگ گر گیا تو جانتی ہو کیا ہو گا۔' البرٹ مسکراتے ہوئے اس کی گوری

ہتھیلی پہ اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے اور کھڑکی سے باہر بادلوں سے گھرے کالے آسمان کو تکنے لگتا ہے۔

"نہیں! میں نے خود سے کیٹ لاگ دیکھا تھا اور ڈاکٹر نے وہی نمبر لا کر مجھ میں انجیکٹ کیا تھا اس لئے......"

میری باہر کے اندھیرے سے کمرے کو بچانے کے لئے تیزی سے اٹھتی ہے پہلے کھڑکی بند کرتی ہے۔ پھر کمرے میں ٹیوب لائٹ روشن کر کے مسکرانے لگتی ہے۔

☆

ڈلیوری کی تاریخ بھی وہی تھی۔ اس دن میری کا برا حال ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے ذہن کے ریس کورس پر وہائٹ ہارس پوری برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ بار بار مسکرا رہی تھی۔ دوسری طرف اسی کمرے کے باہر البرٹ عالم پریشانی میں ادھر ادھر لیفٹ رائٹ کر رہا تھا، اور اس دوران کئی بار اس کے ذہن کے ٹریک پہ وہائٹ ہارس کو گرا کر اس کا بلیک ہارس آگے بڑھ گیا تھا۔ اس وقت وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔ سینئر ڈاکٹر نے اس حرکت پہ اسے ڈانٹا بھی۔ عین اسی وقت اندر کے کمرے سے نکل کر ایک نرس نے البرٹ کو بتایا" بیٹا ہوا ہے"۔ ایک بار پھر اسے لگا کہ فنیشینگ لائن تک پہنچتے پہنچتے وہائٹ ہارس کو ناک کے بل گرا کر اس کے بلیک ہارس نے رنگ و نسل کی یہ دوڑ جیت لی ہے۔ ایک بار پھر وہ زور زور سے تالیاں بجانے لگا تھا۔ اس بار سینیر ڈاکٹر نے ڈانٹنے کے بجائے بڑی ہی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے مبارک باد دی۔ اس کے جواب میں البرٹ نارمن اس سے لپٹ گیا تھا۔ اور پاگلوں کی طرح اس کے ہاتھوں کو چومنے لگا تھا۔

دوسرے دن میری پوری طرح سے ہوش میں آگئی۔ آپریشن ہوا تھا اس لئے درد سے اس کا پورا شریر ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اپنے اندر کافی کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی وہ اپنے بچے کی دیکھ بھال پوری طرح سے کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے نرس کو بچہ لے جانے نہیں دیا تھا۔ بچے کو اس نے آج وہی سفید میں کالے ڈیزائن والا لباس پہنایا تھا۔ جب بھی وہ روتا میری اسے فوراً دودھ پلا دیتی۔ البرٹ کے آنے سے قبل وہ قریب تین چار بار دودھ پلا چکی تھی اور اب بھی پلا رہی تھی۔

میری کے کیبن کا دروازہ آہستہ سے چرچرایا اور کھل گیا۔ سامنے البرٹ مسکرارہاتھا۔اس کے ایک ہاتھ میں دودھ کا فلاسک تھااور دوسرے ہاتھ میں پھل اور کپڑے کا بیگ۔ میری کی نظر جیسے ہی البرٹ پر پڑی اسے دیکھتے ہی وہ پہلے کچھ شرمائی۔ پھر اچانک اسے کچھ خیال آیااور وہ دودھ پیتے ہوئے بچے کو سفید چادر میں چھپانے لگی۔ لیکن چادر.........

البرٹ اب بالکل اس کے سامنے رکھے ہوئے ٹیبل پہ آکر بیٹھ گیا تھا۔اس کی آنکھیں میری کی چھاتی چوستے ہوئے بچے پر جیسے ہی پڑیں اس کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر ہوا کارخ یکایک بدل گیااور پل بھر میں اس کی آنکھیں لال پیلی ہو گئیں۔ میری اس سے پہلے کہ کچھ سمجھتی یااس سے کچھ پوچھتی کہ اس نے دانت کچکچاتے ہوئے تیزی سے اپنا ہاتھ بچے کی طرف بڑھادیا۔ میری کے کمزور جسم میں پتا نہیں اس وقت اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ اس نے فوراًاپنے ایک ہاتھ سے البرٹ کے ہاتھ کوزور سے پکڑلیا۔

"یہ کیاکررہے تم۔؟"میری روز کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔

دنیاکا بیوٹی فیکشن۔ مجھے بھی ان کالے بچوں سے.........."یہ کہتے ہوئے البرٹ ایک بار پھر بچے کی طرف تیزی سے جھپٹ پڑا۔

لیکن میں تمہیں ایسا کرنے نہیں دوں گی۔ کیوں کہ یہ میری کوکھ کادرد ہے۔ میرا اپنا خون ہے۔"

میری اس کے ہاتھ کوزور سے پکڑے پکڑے زاروقطار روپڑی۔

"لیکن یہ میرا خون تو نہیں ہے......"اتنا کہتے ہی اسے اندر سے ہنسی آجاتی ہے اور وہ بچے کو بے تحاشا چومنے لگتا ہے۔

"میری ! واقعی اس روز تمہاری باتوں میں کتنا دم تھا۔ وہائٹ میں بلیک کا (COMBINATION) دیکھو آج کتنا جچ رہاہے۔"

میری ہنس دیتی ہے۔

☆☆☆

ننگی آنکھوں کی بھوک

"مرد وحشی درندے کی مہذب ترین شکل ہے۔ لیکن عورت کو قریب پاکر کبھی کبھی وہ اس سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ اس لئے تمہیں ڈور پہ اپنی گرفت اور روشنی پر قابو رکھنا ہوگا۔ ورنہ تمہیں ننگا کر کے روشنی کرتے اسے دیر نہیں لگے گی۔"

شادی سے ایک دن قبل، مرد کی ننگی آنکھوں کا شکار ہوئی ایک سہیلی نے اپنا درد و غم سنا کر نصیحت کی تو کاجل نے ان باتوں پر مضبوطی سے گانٹھ باندھ لی۔

شام ہو چکی تھی۔

ایک طرف عورتیں ہلدی لگا رہی تھیں اور دوسری طرف کاجل کے ذہن کا دائرہ پھیل رہا تھا۔ لڑکیوں میں چھیڑ چھاڑ کا عمل جاری تھا۔ ایک نے ہلدی لگانے کے بہانے ایسی جگہ ہاتھ رکھا کہ کاجل چیخ اٹھی تھی۔

"نہیں۔ نہیں۔"

پھر اس کے اعصاب خود بخود تنتے ہی چلے گئے تھے۔ کچھ دیر میں وہ بے ہوش ہو گئی جب ہوش میں آئی تو اس نے پھر چیخنا شروع کر دیا۔

”میں کہتی ہوں نا پہلے بتی بجھاؤ۔“

پورے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ کسی نے جادو سمجھا تو جادو ٹونا والے کو بلا لائے۔ کسی نے بیماری جانا تو ڈاکٹر کو پکڑ لائے۔ اور کسی کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو رونا شروع کر دیا۔ ایسا دورہ اسے کبھی نہیں پڑا تھا اس لئے سب پریشان تھے۔ بہر حال ڈاکٹر کی دوا اور جھاڑ پھونک کرنے والے کے منتر نے آپس میں مل جل کر کچھ اپنا ایسا اثر دکھایا کہ گھنٹہ بھر کے اندر ہی کاجل ہوش میں آ گئی۔ لیکن اس کے بعد بھی اس کے اعصاب میں کھینچاؤ سا ہوتا رہا۔ اور جب بھی اعصاب کے کھینچاؤ میں اضافہ ہوتا اس کے ہاتھ کا دباؤ کمر پہ بڑھ جاتا اور نظر ٹیوب لائٹ کی طرف اٹھ جاتی۔

قریب گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے جیسے کائنات کی ساری پریشانیاں اس کے وجود سے آ کر چپک گئی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا، ویسے ویسے اس کے چہرے سے پریشانی کے حروف مٹتے جا رہے تھے۔ جب وہ اپنی پہلی حالت میں چلی آئی تب اس نے اپنا فیصلہ مضبوط ذہن کو سنا دیا کہ وہ ڈور اور روشنی کو......

کاجل ایک ضدی قسم کی لڑکی تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی تھی اور لاڈ و پیار میں جوان ہوئی تھی۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی ضد کو گھر والوں نے پورا کیا تھا۔ اس لئے جب کاجل نے اپنی جوانی کا فیصلہ گھر والوں کو سنایا تو گھر والے بھی اس کے اس فیصلے کو سنی ان سنی نہیں کر سکے مجبوراً گھر والوں کو ہاں کرنا پڑی۔ اس طرح سے پردیپ اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے چلا آیا تھا۔

شادی کے دن بھی وہ اندھیرے اور اجالے کے درمیان الجھی رہی کہ کہیں میرے ساتھ بھی......؟ نہیں نہیں...... پردیپ تو میرا اپنا ہے...... وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا...... لیکن اگر اس نے بھی ایسا ہی کیا تو......؟

اس الجھن کو لئے دوسرے ہی دن کاجل سسرال پہنچ گئی۔

سہاگ کی رات صرف کاجل کے لئے نہیں بلکہ ہر کسی کے لئے یادگار ہوتی ہے۔ اس لئے کاجل بھی سرخ جوڑے میں لپٹی، سمٹی، ہنگاموں سے بے خبر، پلکوں پہ حسین

خواب سجائے ایک ایسی مدھر چاپ کی منتظر تھی جو اس کی روح کے تار پر زندگی کا کوئی رس بھرا گیت چھیڑ کر اسے اس طرح مدہوش کر دے کہ اس کی نس نس سے محبت رسنے لگے۔

ابھی کاجل کی سوچ کی ریشمی ڈور میں الجھی ہوئی تھی کہ اس کے اپنے شہزادے کی مدھر چاپ سیج پر آکر ٹھہر گئی۔ رسمی منہ دکھائی اور انگوٹھی سے جب بات آگے بڑھی تو کاجل کا چہرہ شرم وحیا اور خوشی و مسرت کے امتزاج سے اور گلنار ہو گیا۔

"تمہارا نام کاجل کس نے رکھا۔؟" پردیپ نے یکایک وہی جملہ دہرادیا جس سے محبت کی شروعات ہوئی تھی۔ اور ایسے میں کاجل نے وہی جواب دیا جو پہلی ملاقات میں مسکراتے ہوئے پردیپ کو دیا تھا۔

"بچپن میں لوگ مجھے چینی کی گڑیا کہا کرتے تھے شری مان۔!" وہ ہنس رہی تھی۔ "لوگوں کی نظر نہ لگ جائے اس لئے ماں ہر روز مجھے کاجل کی بندیا لگایا کرتی تھی اور دیکھتی رہتی تھی کہ بندیا ہے یا نہیں۔ مٹتے ہی دوبارہ لگادیا کرتی۔اس طرح گھر والوں نے مجھے کاجل کے نام سے ہی پکارنا شروع کر دیا تاکہ......"

"دوسروں کی نظر نہ لگ جائے۔ ہے نہ یہی بات۔؟" کاجل، پردیپ کی اس بات پر کھلکھلا اٹھی۔ لیکن میری نظروں سے تم کہاں تک بچتی......؟" کاجل کے چہرے کا نچلا حصہ پکڑ کر پردیپ نے اس کی بندیا پر اپنے گرم ہونٹوں کو رکھتے ہوئے کہا۔اور اب اگر تمہارے نام کی طرح یہ کمرہ بھی کاجل میں بدل جائے، تب تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا۔؟"

پردیپ کی اس بات پر کاجل کیا کہتی: ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ گالوں پہ گڈھے بن کر ٹھہر گئے۔ ہنسی کی رم جھم بارش شروع ہوتے ہی کمرے کی ساری روشنی ٹیوب لائٹ میں سمٹ کر رہ گئی اور کمرہ تاریک ہو گیا۔۔ تاریکی پھیلتے ہی کاجل، پردیپ کی مضبوط بانہوں میں چلی آئی۔ کچھ دیر تک دونوں محبت بھری باتوں میں الجھے رہے۔ پھر یکایک پردیپ خاموش ہو گیا اور پھر اس کا ہاتھ کاجل کے مرمریں جسم سے پھسل کر ناف پر آکر ٹھہر گیا۔

سر۔سر۔سر۔

"نہیں پردیپ! تم ایسا نہیں کر سکتے۔" کاجل نے اندھیرے میں ہی پردیپ کا ہاتھ

زور سے پکڑا اور ایک طرف جھٹک دیا۔

"مگر کیوں۔؟" پردیپ، کاجل کے اس رویے پر بوکھلا اٹھا تھا۔ "پہلے اور اب میں فرق ہے۔اب میں تمہارا پتی ہوں۔" پردیپ نے جھٹکے ہوئے ہاتھ کو سنبھال کر پھر سامنے کر لیا۔

"زبردستی کا دوسرا نام ہی ریپ ہے مسٹر پردیپ۔! خواہ وہ اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔" کاجل نے اس بار پردیپ کی مضبوط کلائی کو اتنی طاقت سے جکڑ لیا کہ پردیپ کو اپنی کلائی ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی۔ایسے وقت میں وہ بالکل بے بس نظر آرہا تھا۔

پہلی رات جو خوشبوؤں میں لپٹی ارمانوں کی سیج کو مہکانے آئی تھی۔ ناکام سی لوٹ گئی۔

دونوں انا کی چادر اوڑھے نئی صبح کے منتظر تھے۔دونوں کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔"اب کیا ہوگا۔؟"اور جواب بھی دونوں کا ایک تھا۔"ایک ساتھ دونوں جی نہیں سکتے۔"

اندھی صبح کا دروازہ کھلتے ہی پردیپ سر جھکائے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور لڑکیاں مسکراتی، اٹھلاتی رات کا حساب و کتاب کرنے کے لئے اندر آگئیں۔ چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ گھنٹوں جاری رہا۔ کاجل سب کچھ چپ چاپ سنتی رہی۔ کر بھی کیا سکتی تھی بے چاری سوائے جھنجھلانے کے۔اور کبھی سوچا کرتی کہ اب اور اگر لڑکیوں نے چھیڑ چھاڑ کی تو وہ اس کے منہ پر کہہ دے گی کہ جا کر پوچھ لے اپنے لاڈلہ بھائی سے کہ رات بھر...... لیکن اتنی ہمت کہاں تھی اس میں۔ بدنامی کا ڈر بھی تھا۔ پھر دس منہ اور دس طرح کی باتیں۔ کس کس کے منہ کو روکتی۔؟ خاموش رہنے میں ہی اس نے عافیت جانی۔

پردیپ کے دوستوں کو بھی جیسے اس کے باہر نکلنے کا ہی انتظار تھا۔ نکلتے ہی سبھوں نے گھیر لیا۔ سب کا ایک ہی سوال تھا۔ تب کیسا رہا۔"کیسی لگیں ہماری بھابی جان۔؟" ان رس بھرے سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ آخر وہ اپنے دوستوں کو کیا بتائے۔ بہت دیر تک وہ جھوٹ اور سچ کے درمیان لٹکا رہا تھا۔ آخر کار بہت سوچ سمجھ کر اس نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ سچ کو کھلی کتاب کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دیتا ہے تو نہ

جانے خوشیوں سے تھرکتے ہوئے کتنے ہی پاؤں یکایک خاموش ہو جائیں گے۔ پھر لوگ تو اسے ہی تھوکیں گے کہ کاجل کو اس نے خود اپنا آئیڈیل بتایا تھا۔ اس کی پسند پر ہی گھر والوں نے رشتے کی بات پکی کی تھی۔ اس لئے مجبوراً اسے آج جھوٹ کا سہارا لینا تھا۔

"اچھی ہیں۔ اور سمجھو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی رہا۔"

"نہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔ سب کچھ کھول کھول کر بتاؤ۔"

"اچھا بابا بتاؤں گا۔ مگر آج نہیں کل پیارے۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

پردیپ کے چہرے کی بناوٹی مسکراہٹ پر کسی کی نہ گہری نظر پڑی اور نہ ہی کوئی بھانپ سکا۔ لیکن وہ تو بچپن کا آرٹسٹ تھا۔ اس لئے زندگی کے اسٹیج پر جب اسے آج جھوٹ کو سچ کرنے کا چانس ملا تو ایسی ایکٹنگ کی کہ نباض وقت بھی دھوکہ کھا گیا۔

کاجل اور پردیپ دونوں الجھنوں کے بھنور میں اس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ اس سے نکلنا دونوں کے لئے بہت ہی مشکل تھا۔ اس لئے اپنی اپنی عزت کی خاطر دونوں پرارتھنا پرارتھنا کر رہے تھے کہ "سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آسمان پر ہی ٹھہر جائے۔" لیکن ایسی پرارتھنا سے کیا حاصل؟ ہوتا وہی ہے جو ہونا ہوتا ہے۔ رات ہوتے ہی دونوں پر وحشت سی طاری ہو گئی تھی۔ اور جیسے جیسے رات کا پہلا پہر بیت رہا تھا۔ ویسے ویسے دونوں ایک دوسرے کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔

لیکن ہوا وہی جو ہونا تھا۔

پردیپ آج کی رات سر درد کا بہانہ کر کے دوسرے کمرے میں سونے کا ناٹک کر رہا تھا۔ لیکن عورتیں بھلا کب ماننے والی تھیں۔ پکڑ کر دلہن کے کمرے تک لے ہی آئیں اور ٹھٹھا مارتے ہوئے بے چارے کو اندر دھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اندر دھکیلنے میں بھابھیوں نے اتنا زور دیا تھا کہ اس کا پژمردہ جسم بے قابو ہو گیا اور وہ سیدھے دلہن کی گود میں جا گرا۔ دلہن کی ایک چوڑی ٹوٹ کر پردیپ کی پیشانی میں چبھ گئی۔ جب خون رسنے لگا تب کاجل کی پریشانی دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ اپنے سرخ آنچل میں خون کو اس وقت تک جذب کرتی رہی جب تک خون کا رسنا بند نہ ہوا۔

"درد تو کافی ہو رہا ہو گا۔؟" کاجل سے رہا نہیں گیا تھا۔

"ہاں! لیکن تمہاری محبت نے دوا کا کام کیا۔" پردیپ نے اس ہاتھ کو چوم لیا جس سے لہو کے پوچھنے کا کام لیا جا رہا تھا۔

دوسری رات نے دونوں کی زندگی میں بہار کے سارے رنگ بھر دیئے تھے۔ اس رات دونوں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح سے گھل مل گئے کہ جیسے کبھی کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

راتیں آتی اور جاتی رہیں......

دن ہنستا اور مسکراتا اپنے گھر لوٹتا رہا......

اس رات اور دن کے بیچ کاجل خوشیوں کی تلاش میں کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ پہلی رات کی تلخ کہانی کو اس نے بھلا کر پردیپ کو پوری طرح سے اپنا لیا تھا۔ اگر بھولے سے کبھی یادداشت کے پردے پر وہ کہانی بولنے لگتی تو وہ اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر زور سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ اس دن وہ پریشان پریشان سی رہتی۔ کچھ بھی اسے اچھا نہیں لگتا۔ پھر دوسرے کام سے خود کو جوڑ کر وہ اپنے آپ کو اس دلدوز کہانی سے دور لے جاتی۔ لیکن وہیں پردیپ اپنے ذہن سے پہلی رات کے اس منظر کو نوچ نہیں پایا تھا، اس لئے وہ اکثر خود سے الجھا رہتا۔ اپنے دوستوں سے اپنا اور بھابھیوں سے جب کاجل کا موازنہ کرتا تب وہ دکھ کے گہرے سمندر میں ڈوب جایا کرتا۔ اور سوچا کرتا کہ اس گھر میں اس کی کیا اہمیت ہے۔؟ مرد ہو کر بھی پہلی رات وہ ایک عورت سے...... یہیں مرد کی نفسیات کو ٹھیس پہنچتی اور تب اس کے اندر کا مرد اسے بری طرح سے للکارتا۔ "تو مرد نہیں ہے۔ ورنہ ایک عورت سے کبھی......؟"

وہ اپنے دوستوں سے جب کبھی پہلی رات کی دلچسپ کہانی سنتا، یا پھر کتابوں میں پڑھتا یا فلموں میں دیکھتا تو وہ اپنی ہی انا کی آگ میں گھنٹوں جھلستا رہتا۔ اس وقت وہ عجیب عجیب حرکتیں کیا کرتا۔ کبھی جوتے کا فیتہ سرے سے کھینچ دیتا، تو کبھی روشن دان کی رسی پکڑ کر جھول جاتا اور کبھی پردے کی ڈور پکڑ کر سڑاک سے کھینچ لیتا۔ ایسا کرنے میں اسے ویسی ہی راحت محسوس ہوتی جیسے تپتی دوپہر میں مسافت کی تھکن لئے ایک مسافر سایہ دار شجر کے نیچے آنے کے بعد محسوس کرتا ہے۔

دوسری رات سے لے کر اب تک کی تمام راتوں میں کاجل کی رضا شامل رہی تھی۔ یہاں تک کہ اب ہر کام میں پردیپ کاجل کی رضا چاہتا تھا۔ پردیپ کی انہی اداؤں پر جب کاجل سو جان سے قربان ہو گئی، تب ایک دن اس نے اس فیصلے کے آگے خود کو جھکا دیا۔ "مرد کو جس میں خوشی ملے عورت کو وہی قبول کرنا چاہئے۔" ایک دن اس سے رہا نہیں گیا۔

"آپ اس طرح سے ہر بات کیوں پوچھتے ہیں۔؟"

"تمہیں اچھا نہیں لگتا ہے کیا۔؟"

"نہیں۔!"

"کیوں۔؟"

"اس لئے کہ تم مرد ہو۔" "اور مرد ہر بات پوچھا نہیں کرتے۔"

کاجل کی اس بات پر پردیپ کے اندر کا مرد باہر آجاتا اور بھونڈی ہنسی ہنستا ہوا اپنی بتیسی باہر نکال دیتا۔

پردیپ کو ایک ایسی ہی رات کا انتظار تھا۔ اس لئے وہ آج بہت خوش تھا لیکن پہلی رات کا عمل دہراتے وقت کاجل نے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر جب ہولے سے ہاتھ رکھا اور آہستہ سے اس کے کان میں کہا تھا "بس بس! اس سے اور آگے ......" تب پردیپ کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کے اندر کا کریہہ صورت مرد باہر چلا آیا۔ جو آگے اور آگے کے بارے میں سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اس نے سوئچ پہ انگلی رکھ دی۔ ٹیوب لائٹ جلتے ہی پردیپ نے اپنی چمکیلی آنکھوں کو سنبھالا، لیکن اس سے پہلے کہ نظریں تسکین حاصل کرتیں۔ کاجل سوئچ بورڈ کی طرف تیزی سے جھپٹ پڑی۔ لائٹ بجھتے ہی پردیپ چیخ اٹھا۔

"ابھی تو تم نے ہی کہا تھا کہ تم ......" پردیپ نے کلائی پکڑ کر اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"لیکن یہ مت بھولو کہ میں ایک عورت ہوں۔" ایک ہی جھٹکے میں کاجل نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "مرد کا جتنا حصہ تھا، وہ میں نے تمہیں دے دیا ہے۔ ایک عورت کا جتنا حصہ ہے، بھگوان کے لئے میرے پاس ہی رہنے دو۔ ورنہ میں ......؟" کاجل رو پڑی تھی۔ رات بھر

روتی رہی اور پردیپ اپنی ہی انا کی آگ میں رات بھر سلگتا رہا کہ آج بھی وہ جیت نہیں پایا۔

ادھر کچھ دنوں سے پردیپ رات گئے گھر لوٹا کرتا۔ رمیش اس کے دوستوں میں سے تھا۔ آج کل اس سے خوب پٹتی تھی۔ شہر کے بیچ اس نے ویڈیو ہال کھول رکھا تھا۔ جہاں دن میں کمرشیل فلمیں دکھائی جاتیں اور رات ہوتے ہی وہاں ننگی چلتی پھرتی تصویروں کی دکان خود بخود سج جایا کرتی تھی۔ یہاں سے گھر لوٹتے وقت پردیپ کی آنکھوں کے سامنے چمکیلی روشنی میں دودھ سا چمچماتا ہوا عورت کا بدن ہوتا۔ اور خط اور دائرے کے بیچ پھسلتی اور رکی ہوئی بے چین اس کی آنکھیں ہوتیں۔ پردیپ اپنی نظروں کی تسکین کے لئے کاجل کو بھی اس روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کیا وہ اسے اب دیکھ پائے گا۔؟ اس سوال کے ابھرتے ہی اس کے ذہن میں ہلچل برپا ہو جایا کرتی۔

اس طرح ایک چکر پورا ہوا۔ اس شام گھر سے نکلتے وقت کاجل نے کہا تھا۔ "دیکھو جی! آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ ہے۔ جلدی لوٹ آنا۔"

اس رات بھی پردیپ رمیش کے ویڈیو ہال سے لوٹ رہا تھا رات کافی ہو چکی تھی قدم بہک رہے تھے۔ وہ پیتا نہیں تھا۔ لیکن پتہ نہیں آج دوستوں کے چکر میں وہ کیسے پھنس گیا۔ راستہ بھر فلم کا وہی منظر جو اس کی آنکھوں میں جذب ہو گیا تھا اس کے سامنے گھومتا رہا ...... فلم کے پردوں کی طرح اس نے بھی آج یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو آج وہ کاجل کا لباس تار تار کر کے اسے تاریکی سے روشنی میں لا کر ہی دم لے گا۔ اگر وہ زور آزمائی پر آئی تو سالی کو منہ اندھیرے میکے کا ٹکٹ پکڑا کر چلتا کر دے گا۔

وہ انتقام کی اس آگ میں بری طرح سے جھلستا ہی جا رہا تھا۔

ویڈیو اسکرین کے گرم منظروں کو سمیٹے جیسے ہی پردیپ نے برآمدے میں قدم رکھا۔ ایک آہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ کاجل سراپا انتظار بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ پردیپ نے کاجل کو دیکھتے ہی کہا۔ "شادی کی پہلی سالگرہ مبارک ہو کاجل جی!" اور پھر اس کے بعد اس کی آنکھوں کی گولیاں ناچنے لگیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اتنی جلدی میں کپڑے اتارے جیسے کسی نے کیلے کے چھلکے کو ایک ہی بار میں چھیل دیا ہو۔ کاجل

کھانا نکالنے کے لئے باورچی خانہ کی طرف جانے لگی تو پردیپ نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے اوپر گرالیا۔ آج کی یہ حرکت کاجل کو بری نہیں لگی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ پردیپ کے بدلے ہوئے روپے اور پینے کی طرف اس کا ذہن بھی نہیں گیا۔ ہاں پان کی خوشبو اسے آج اچھی لگ رہی تھی۔ اس لئے اس نے بھی نزاکت کا سہارا لیا۔

''چھوڑو بھی۔ مجھے کھانا نکالنا ہے۔''

آج پردیپ کو کھانے کا ذائقہ کچھ اور ہی لطف دے رہا تھا۔ ویسے تو ہر روز کی طرح کاجل سامنے بیٹھی تھی۔ گندم کی اجلی روٹی کو جب وہ دانتوں کے درمیان دباتا تو اس کی نس نس میں سرور و مستی چھا جاتی۔ اس وقت وہ کاجل کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ ریمیش کے ویڈیو ہال میں بیٹھا ہو اور کاجل اس کے سامنے اسکرین پر......

''اس طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا گھور رہے ہو۔؟'' کاجل یونہی مسکرانے لگی تھی'' ''کوئی خاص بات ہے کیا جناب!''

''ہاں! بس ایسا ہی سمجھو۔'' پردیپ نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا۔

''چھوڑو بھی۔ مجھے نیند آرہی ہے۔'' کاجل نے شرارت بھرے انداز میں اسکے گالوں کو چیونٹی کا مزہ دیا۔

''نیند تو مجھے بھی آرہی ہے۔'' پردیپ نے گنجی اتار کر سینے کے الجھے ہوئے بالوں پر جب انگلیوں سے کنگھی کا کام لیا تو خود کو ایک عجیب لذت سے دوچار پایا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر کاجل کو پکڑ لیا۔ آج کاجل نے وہی سرخ جوڑا پہن رکھا تھا۔۔ جس جوڑے میں اسے پردیپ نے سہاگ کی پہلی رات کو دیکھا تھا۔ بناؤ سنگھار سب کچھ پہلی رات کی ہی طرح تھا۔ اس لئے اس کی نس نس میں آج شرارت ہی شرارت دوڑ رہی تھی۔ اس وقت اس نے پردیپ کے سر پر ایک ہاتھ رکھ کر اسے ذرا نیچے جھکایا اور ایڑیوں کے سہارے ذرا سا اچک کر اس کے گرم گرم ہونٹوں پہ اپنی بندیا رکھی۔ پہلے مسکرائی اور پھر چہک کر بولی۔

''اب اگر میرے نام کی طرح یہ کمرہ بھی کاجل میں بدل جائے تب تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا۔؟''

"نہیں میری جان۔!"

پردیپ کا "نہیں" کہنا تھا کہ کاجل نے ٹیوب لائٹ کی سوئچ پر اپنی انگلی کو رکھ دی۔

کمرے میں اندھیرا پھیلتے ہی پردیپ نے کاجل کو پکڑنا چاہا لیکن اس سے پہلے کاجل نے پیچھے سے اسے دھر دبوچا.........

پردیپ انا کی آگ میں برسوں سے جل رہا تھا۔ وہ آج کی اس رات کو کسی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک طرف سہاگ رات کے سارے مناظر یکے بعد دیگرے رقص کر رہے تھے تو دوسری طرف اسکرین پر.........اس لئے وہ آج موقع کی تاک میں روشنی کا پھن کاڑھے اندھیرے میں چھپا بیٹھا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ کاجل کے اوپر سے چادر کھینچ کر.........

تھوڑی ہی دیر کے بعد پردیپ کو جیسے ہی لگا کہ وہ سنہری موقع اس کے ہاتھوں آگیا ہے تو اس کے ہاتھوں میں آہستہ آہستہ سختی آنے لگی تھی۔ کاجل بھی اس سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ فوراً اس بات کو بھانپ گئی۔ اس لئے اس نے چادر کے ایک کونے کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ ٹھیک اسی وقت پردیپ نے چادر کے ایک سرے کو پکڑا اور......اور اس سے پہلے کہ وہ چادر کو کھینچتا، کاجل نے چادر کھینچ لی۔ اور لائٹ آن کر دی۔

"ارے، ارے! پاگل ہو گئی ہو کیا۔؟"

آج پردیپ کاجل کی اس حرکت پر بری طرح سے بوکھلا گیا۔ اس لئے اس کے چہرے کا رنگ یکایک بے رنگ ہو گیا تھا۔ پھر وہ چادر کی طرف تیزی سے جھپٹا اور خود کو روشنی سے بچاتے ہوئے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

روبہ زوال

نئی نسل پرانی نسل کو نگل رہی تھی......

صدیوں کا سفر، صدیوں کی اور سفر کر رہا تھا کہ جڑواں بچے کی پہلی آمد نے تاریخ آدم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ایک بچے کی ایک آنکھ نہیں تھی تو دوسرے کا ایک پیر کمر سے ہی الگ۔

زمین و آسمان حیراں

ذرہ ذرہ پریشاں

دونوں بچوں پہ جس شخص کی پہلی نظر پڑی تھی وہ دیکھتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اور پاس کا ہجوم بھی آہستہ آہستہ منتشر ہو گیا تھا۔ لوگ بچے کی پرچھائیں سے اس لئے خوف زدہ تھے کہ اگر اس کی پرچھائیں اس عورت پر پڑ گئیں جو خود کو قید کئے بیٹھی ہے تو وہ بھی ویسے ہی بچے جنمے گی۔

اندھے۔!

لنگڑے۔!!

"ان بچوں کی وجہ سے سارے گاؤں میں افرا تفری مچی ہوئی تھی۔ جتنے لوگ اتنی باتیں۔

"یہ بچے اپنے ہمراہ مصیبتوں کا سمندر لے کر اس دھرتی پر وارد ہوئے ہیں۔ اس گاؤں کو مصیبتوں سے نجات دلانے کے لئے دونوں بچوں کو زندہ دفن کرنا ضروری ہے"۔ سفید بال والے شخص نے بھیڑ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر ایسا کرنے پر ان کے ماں باپ راضی نہیں ہوئے تو۔؟"

"یہ سارے گاؤں کا معاملہ ہے۔ اس لئے ہم سب مل کر ان کے گھر والوں پر دباؤ ڈالیں گے۔"

"چلو بھائیو! چلو۔ چلو۔"

بھیڑ بچے کے گھر کو گھیرے ہوئے تھی۔ ماں باپ پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ پہلے تو دونوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہوئے۔ لیکن جب بار بار گاؤں کو مصیبتوں سے بچانے کی دہائی دی گئی تو باپ جیسے تیسے کر کے مان گیا۔ لیکن وہ ماں جو نو ماہ تک اپنی کوکھ کا درد برداشت کرتی رہی تھی۔ سسک پڑی، سسکتی رہی۔

وقت کب، کیسے گذرا کسی کو پتہ نہیں چلا۔ اور جب پتا چلا تو اس وقت تک گاؤں والوں کو دونوں بچوں سے کچھ نہ کچھ انسیت ہو ہی گئی تھی۔ وقت کے پیچھے پیچھے دونوں دوڑتے رہے.........

دوڑتے دوڑتے چار ہو گئے۔

اندھے۔ لنگڑے۔

گونگے۔

اور بہرے۔

پھر چاروں دنیا کی چار سمت پھیل گئے۔

پورب۔

پچھم۔

اتر۔

اور دکھن۔

اب صدیوں کا سفر صدیوں کی اور سفر کرتے کرتے کچھ تھم سا گیا تھا۔

نئی نسل۔! کسی کی ایک آنکھ نہیں تھی تو کوئی دونوں ٹانگوں سے معذور۔ کسی کے دونوں پاؤں سلامت تھے تو کوئی سن اور بول نہیں سکتا تھا، اور کسی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

ہاتھ نہ پاؤں، آنکھ نہ ناک، سر نہ دھڑ............

اور جب ایسا ہوا: تب سفید پوش شخص کی باتیں لوگوں کے ذہن میں ہتھوڑے برسانے لگیں۔ اور تب لوگ مضطرب و پریشان عیبوں کی پوٹلی لئے نجات کا ذریعہ ڈھونڈنے لگے۔ ان کی پریشانی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ڈاکٹر اور حکیم کا گھر تک بھول گئے تھے۔ بالآخر بھول کے اس سلسلے کو ایک عقلمند نے ختم کیا......

جب گاؤں والے اپنی اپنی عیبوں کی پوٹلی لئے ڈاکٹر اور حکیم کے گھر پہنچے تو لوگوں کے سر سے آسمان سرک گیا تھا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر کے چشمے کا ایک گلاس سیاہ تھا اور حکیم بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔

دروازے ایک کے بعد ایک کھٹکھٹائے جاتے رہے۔

اور سارے دروازے اسی طرح سے کھلتے اور بند ہوتے رہے۔ مگر سب بے سود۔!

نجات کا یہ مسئلہ جب آہستہ آہستہ کافی گمبھیر ہو گیا تو اس سے چھٹکارا پانے کے لئے گاؤں والے ایک دن ایک جگہ جمع ہوئے۔ جہاں سب کو کھلے عام رائے دینے کی اجازت تھی۔

"آج لولے، لنگڑے، گونگے، بہرے، اندھے اور کانے بچے کثیر تعداد میں پیدا کیوں ہو رہے ہیں۔ ہزاروں سال قبل تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کیوں نہ ہم آج ہی نسبندی کر والیں۔ پھر نہ ہی ہماری پاک دھرتی پہ ایسے بچوں کے گندے پاؤں پڑیں گے اور نہ ہی کبھی ہماری آنے والی نسل کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔

مکھیا کی ان باتوں پر گاؤں والے ردوکد پر اتر آئے۔

"نہیں یہ بھگوان کی دین ہے۔"

ہمارے مذہب میں ایسے بچوں کا قتل جرم ہے۔

"اس طرح ہماری نسل دم توڑ دے گی اور ہم بے منزل، بے نشان اور بے سمت ہو کر رہ جائیں گے۔"

ایک رات۔

گاؤں کے ایک شخص نے خواب میں ایک ایسے دیو قامت شخص کو دیکھا جس کا ناخن سے لے کر، بال، چمڑے اور کپڑے بھی سفید تھے۔ وہ اسے جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا۔

"یہ لو لیے، لنگڑے، گونگے، بہرے، اندھے اور کانے بچے جو تمہاری اپنی نسل ہیں، جوان ہو کر جب تمہیں نگل رہے ہیں تب تم ان سے نجات کا ذریعہ ڈھونڈ رہے ہو۔ اب تمہیں ان اپاہج بچوں سے کبھی نجات نہیں مل سکتی ہے"۔

"کیا نجات کے لئے سارے راستے بند ہو چکے ہیں۔؟" اس شخص کی آنکھوں میں آنسو اتر آیا۔

"کیا زندگی بھر ہمارے بچے ہمارے لئے عذاب بنے رہیں گے۔؟"

"ہاں اب تم سب چاہ کر بھی اپنے عذاب کے حصار کو، توڑ کر اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔؟"

"نہیں، نہیں۔ ایسا مت کہیے۔" وہ شخص پاؤں پکڑ پکڑ کر گڑگڑانے لگا تھا۔ "ہمیں ہر حال میں اس سے نجات چاہیے۔"

"اچھا تو پھر وعدہ کرو......"

'ہاں میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی ہماری نسل میں ایسے بچے پیدا نہیں ہوں گے، اور اگر غلطی سے ہو بھی گئے تو ہم اسے زندہ..........."

ادھر سورج نکلا اور ادھر بات روشنی کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ بھوکے پیاسے دیو قامت شخص کی تلاش میں نکل پڑے۔ گلی، کوچے، میدان، پہاڑ اور پٹھار جہاں تک ممکن ہو سکا ڈھونڈتے رہے۔ لیکن...... آخر کار ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب تھک گئے

تو مایوسی کی چادر اوڑھے اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔

دن میں مزدوری کر کے شام کو جب تھکے ہارے گھر لوٹتے تو سارے لوگ کہیں نہ کہیں جمع ہو جاتے۔ اور ...... اس شب بھی سارے لوگ ایک وسیع میدان میں جمع ہوئے تھے۔ اس شب بھی وہی ساری باتیں دہرائی جا رہی تھیں۔ اور اس شب بھی لوگ وہی سن رہے تھے کہ یکایک دیو قامت شخص جس کے ناخن سے لے کر بال اور چمڑے سے لے کر کپڑے تک سفید تھے، ہجوم کے بیچ نمودار ہو لئے۔ جس کے دائیں ہاتھ میں مشعل تھی۔ یہ دیکھتے ہی لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ لیکن وہ شخص جس نے انہیں خواب میں دیکھا تھا، فوراً ان کے پاؤں پر گر پڑے۔ لوگ گرتے رہے اور آنسوؤں سے ان کے وپاؤں دھوتے رہے ...... گڑگڑاتے رہے ......

"ہمیں نجات چاہیے۔ ہمیں نجات دلائیے۔"

دیو قامت شخص نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں لہرایا۔ مشعل کی لو بھڑک اٹھی۔ دیو قامت شخص نے مشعل کو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے رکھ کر پوچھا۔

"تمہیں ان شعلوں کے درمیان کچھ نظر آ رہا ہے۔؟"

سب نے عالم تذبذب میں اپنی اپنی آنکھیں شعلوں میں ڈال دیں۔ ساری آنکھیں کچھ پانے کی تمنا میں جھلستی رہیں ...... کئی ایک آنکھیں جب لوگوں نے گنوا دیں تو گڑگڑانے کے علاوہ ان کے پاس اب بچا کیا تھا۔

"اے عالم ور ہبر! ان شعلوں میں ایک وسیع پہاڑ، کھائی۔ کھائی کے سینے سے گذرتا ہوا خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں کا ایک پر اسرار راستہ ...... اور پہاڑ کی چوٹی پر ایک فقیر بیٹھا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

اگر تمہیں ان مصیبتوں سے نجات چاہئے تو تم سب کل اس پہاڑ پر سورج کے طلوع ہونے سے قبل پہنچ جاؤ ...... تمہاری ساری مصیبتیں وہاں پہنچتے ہی ختم ہو جائیں گی۔" دیو قامت شخص اتنا کہہ کر کہیں روپوش ہو گیا۔

لوگوں کے چہرے خوشیوں کی لالی سے بھیگ گئے ......

رات کے جنم لیتے ہی لوگ اپنی اپنی عیبوں کی پوٹلی لئے پہاڑ کی ترائی میں جمع ہونے لگے۔ لوگوں کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔

پہاڑ کے پاس کھائی کے قریب پہنچ کر لوگ رک گئے۔ کیوں کہ آگے بڑھنے کے لئے کوئی سبیل نہیں تھی۔ ایک سبیل تھی جو کھائی کے درمیان تھی۔ جس کے وجود سے لمبی لمبی خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹے سر نکالے ہوئے تھے۔ لمبی لمبی خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے لوگ دوسری سبیل کی تلاش میں ادھر ادھر پاگلوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔ وقت کا بہاؤ تیز سے تیز تر ہوتا جارہا تھا۔

ادھر سورج اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ اور ادھر ایک آواز گونج رہی تھی۔ ''جلدی آؤ۔'' جس کی لپیٹ میں سارا شہر چلا آیا تھا۔ لوگوں کی خوفزدہ نظریں پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے فقیر پر صاف پڑ رہی تھیں۔ لوگ اب دوسری سبیل کی تلاش کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ لیکن تلاش کا سفر جاری تھا۔

لوگ اب بھی دوڑ رہے تھے۔ گر رہے تھے۔ پھر دوڑ رہے تھے۔ اس آس میں کہ کوئی دوسری سبیل نجات کا ذریعہ بن جائے اور ان کا وجود چھلنی ہونے سے.........

سورج اب اپنا بستر چھوڑ چکا تھا۔ لیکن اس کی پلکیں نیند کے خمار سے اب بھی بوجھل تھیں۔ وہی آوازیں ایک بار پھر پہاڑوں کے سینے میں اتر گئیں۔ پہاڑ لرز کر رہ گیا۔

جلدی آؤ۔ جلدی۔! ورنہ وقت تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے گا اور تم...... تم اسی طرح سسکتے اور تڑپتے رہ جاؤ گے۔''

فقیر کے ہاتھ اس سمت اٹھے ہوئے تھے جہاں ہلکی ہلکی سرخیاں تیر رہی تھیں۔

اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹنے لگا تھا اور ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ اور جلد سے جلد چوٹی پر پہنچنے کے چکر میں لوگوں نے اپنی اپنی مشعلیں کھائیں میں پھینک دیں۔ کھائی سرخ سمندر میں بدل گئی۔

سورج کے خوف سے لوگ خاردار جھاڑیوں اور لمبے لمبے نوکیلے کانٹوں کی سبیل پر اپنے اپنے وجود کو کھینچتے رہے کہ کہیں.......

کھائی میں کسی چیز کے گرنے کی آواز رک رک کر مگر مسلسل آرہی تھی۔ فضاؤں میں جلے ہوئے گوشت کی بو رچی بسی ہوئی تھی۔ آسمان دھواں دھواں تھا۔

کہانی ختم ہو گئی۔ راوی نے کہا۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ سارے لوگ اپنے اپنے گھر جانے کے لئے جیسے ہی کھڑے ہوئے راوی نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بھائیو! کہانی ختم تو ہو گئی۔ لیکن کہانی اب بھی جاری ہے۔"

لوگ دائرے میں سمٹ کر بیٹھ گئے تو راوی نے کہانی جاری رکھی......

"وقت کے پر لمبے ہوئے تو میں بھی جواں ہو گیا۔ اور جب صدیوں بعد اپنی بند آنکھیں کھولیں تو میری چیخ نکل گئی کہ میرے چاروں بچے...... اندھے، لنگڑے، گونگے اور بہرے ہیں۔" یہ کہتے کہتے راوی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بھیگی ہوئی آنکھوں سے اس نے لوگوں کو غور سے دیکھا ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ راوی نے رکیک آواز میں سوال کیا۔

"کیا نئی نسل ایک بار پھر پرانی نسل کو نگل رہی ہے۔؟

اور صدیوں کا سفر صدیوں کی طرف سفر کرتے کرتے تھک گیا ہے۔"

راوی کے اس سوال پر سب خاموش تھے۔

☆☆☆

نسل کشی

"......اور ان عورتوں کے ساتھ جو ہم سے نہیں ہیں، تب تک ریپ کرو جب تک کہ وہ سب کی سب پریگنینٹ نہ ہو جائیں۔"

نئی اور پرانی قوموں کے درمیان صدیوں کی یہ لڑائی، صدیوں سے اسی طرح جاری ہے۔۔۔

اور ادھر جب نئی قوم کے اثر ورسوخ کو عالمی سطح پر پھیلتے ہوئے پرانی قوم نے دیکھا تو ان سے یہ پذیرائی دیکھی نہیں گئی اور خود بخود احساس کمتری کا شکار ہوتی چلی گئی، کہ اگر اب ہم سے کچھ اور لوگوں کی حمایت نئی قوم کو حاصل ہو جائے یا ہو گئی، یا پھر چھوٹی چھوٹی قوموں کی نظریں ادھر اٹھ گئیں تو دنیا کے نقشے پر ہماری قوم کا کیا حشر ہو گا۔؟ اقلیت، اکثریت میں بدل کر ہمیں آنکھیں دکھائیگی۔ تب کون پوچھے گا ہمیں۔؟ اور کہیں ہمارا صدیوں کا وجود ہی مٹ گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہو گا۔؟

ایسے اور اس طرح کے بہت سارے سوالوں نے مل کر جب انہیں بری طرح سے جھنجھوڑ دیا تب وہ سب اپنی قوم کے تحفظ کیلئے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار لئے نئی قوم کی سرحدوں

میں ایستادہ فوجی لشکروں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے......

سالہاسال یہ لڑائی جاری رہی ......دونوں طرف سے لاکھوں جانیں تلف ہوئیں۔

لیکن جیت اس کی ہوئی جس کے پاس طاقت تھی۔ جس کے پیچھے سپرپاور تھی۔ نئی قوم جب چاروں خانے چت ہوگئی تو ایسے مرد مجاہد قوم کی حفاظت میں پیش پیش تھے۔ ان کے گھروں پہ شب خوں مار کر مردوں کو بندی بنایا گیا۔ قطار میں ہزاروں ہزار مردوں کو کھڑا کر کے گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ بھاگنے کی کوشش کرنے والے سرحدوں پر مارے گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی ریگ زاروں میں گھسیٹا گیا۔ پل کے بیچوں بیچ لوگوں کو کھڑا کر کے دونوں طرف سے تیز رفتار گھوڑے دوڑائے گئے۔ بسوں کے ذریعے بھاگتے ہوئے لوگوں پر لانچر سے کہیں راکٹ برسائے گئے تو کہیں پناہ گزینوں کے کیمپوں میں بھاری بم بارڈنگ کر کے انہیں تہس نہس بھی کیا گیا۔

جنرل میجر کے ہونٹوں پہ خوشیاں محو رقص تھیں۔۔۔

”ہم نے اپنے پلان کے تحت سارے مردوں کو خاک میں سلادیا ہے۔ اس لئے آج ہم سب خوشیاں منائیں گے......ناچیں گے......گائیں گے......اور ......اور ان کی ایک ایک عورت کے ساتھ اس وقت تک ریپ کریں گے جب تک کہ وہ سب کی سب پریگننٹ نہ ہو جائیں۔ لیکن یادرکھو کہ یہ بھی ہماری جنگ کا ہی ایک حصہ ہے۔“

میجر کی باتوں پہ بیشتر فوجیوں کے چہرے اس وقت خوشیوں سے دمک اٹھے۔ اپنی سرحدوں سے نکلے اور عورتوں کو چھوئے انہیں ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ میجر کی بات ختم ہوتے ہی کچھ شراب کی بوتلیں کھولنے لگے۔ کچھ جھومنے لگے۔ کچھ وحشیانہ آوازیں نکالنے لگے۔۔۔اور پھر موج و مستی کی اس ندی میں ایک ایک کر کے سب ڈوبتے چلے گئے۔

عورتیں روتی رہیں۔ لیکن آج ان کی چیخ و پکار اور فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔؟

گھر گھر ننگاناچ جاری تھا۔۔۔

جنرل میجر اس سہانے منظر کو اپنی آنکھوں کے کیمرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

قید کرنا چاہتا تھا۔اس لئے وہ گھروں گھر نکل پڑا۔۔دروازہ کھلوانے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ وہاں ہر گھر آج کے لئے بغیر دروازے کا ہو کر رہ گیا تھا۔ فوجیوں کو جہاں اور جس حال میں عورتیں مل گئی تھیں وہیں دھر دبوچا تھا۔ لیکن ایک گھر کا دروازہ اندر سے پوری طرح بند تھا۔ میجر چلتے چلتے رک گیا۔ اس گھر کا دروازہ زبردستی کھلوایا گیا۔اندر اس کا ایک فوجی تھا۔ میجر نے بغور دیکھا۔ عورت پوری طرح کپڑوں میں تھی۔نوجوان کی وردی بھی پسینے سے تر نہیں تھی۔بال بھی سلجھے ہوئے تھے اور چادر کی سلوٹیں بھی ٹوٹی نہیں تھیں۔

"حرام خور۔!"میجر نے غضبناک نگاہوں سے فوجی کو دیکھا اور ایک بھرپور طمانچہ لگادیا۔پھر اس عورت کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

"لے۔۔چل۔۔جلدی کر۔"

وہ اسی طرح سے سر جھکائے کھڑا رہا۔

"سالے کھولتا ہے یا میں......"

اس بار نوجوان نے ڈرتے ڈرتے نظریں اوپر کیں۔

"سر!ان عورتوں کا قصور صرف اتنا ہے نا کہ یہ ہماری عورتوں میں سے......"

"سور کہیں کا۔ہمدردی جتلاتا ہے۔"

میجر نے لاتوں سے اس کا بھرپور سواگت کیا۔ پھر منت سماجت کرتی عورت کے سارے کپڑے اتار کر نوجوان کی طرف ڈھکیلتے ہوئے چلایا۔

"چل۔یہ آخری وقت ہے تیرے پاس۔۔۔۔۔"

"اگر ہماری عورتوں کے ساتھ ایسا ہوا ہوتا تو آپ کو کیسا لگتا......؟"ہونٹوں سے رستے ہوئے خون کو ایک ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے فوجی نے تیکھی نظروں سے میجر کو دیکھا۔

میجر نے فوجی کی اس ہتک آمیز بات پر پہلے تو چیخ چیخ کر آس پاس کے گھروں میں زور آزمائی کر رہے نوجوانوں کو بلایا اور پھر اس باغی فوجی کی جم کر دھنائی کر دی۔

"سالے یہ کیا تیری بہن ہے؟"

''تیری کوئی بہن ہے کیا۔؟''

''کمینے تیری یہ ہمت۔۔؟''

پھر میجر نے اس نوجوان فوجی کے ساتھ پہلے اپنے اور بعد میں فوجیوں کے ذریعہ وہی گھناؤنا فعل دہرایا، جو نئی قوم کے عورتوں کے ساتھ گھر گھر جاری تھا۔ سانس کے رکتے ہی اسے اسی گھر کی چھت سے جھولتے ہوئے پنکھے میں بنا عضو خاص کے ننگا لٹکا دیا گیا۔

اس کے بعد سارے فوجی اور بھی مستعدی کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں جٹ گئے کہ کہیں......

کچھ عورتوں نے دوران فعل ہی دم توڑ دیا۔ کچھ سہمی سہمی عورتوں نے دم توڑنے کے لئے خود کو مجبور کیا۔ موقع ملتے ہیں چھت سے کود گئیں۔ کنویں میں ڈوب گئیں۔ زہر کھالیا۔ کچھ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر پائیں کہ ان کے اوپر فوجی سائے کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ ہڈیاں نوچ رہے تھے ......اور کچھ نے رونے پیٹنے اور چیخنے چلانے سے بہتر خود کو سپرد کر کے اپنی جان بچانے میں ہی عافیت جانی۔

مہینوں یہ عمل گھر بدل بدل کر فوجیوں کے ذریعے جاری رہا۔

پھر وقت آہی گیا۔ اور بہت ساری عورتیں پریگنینٹ ہو گئیں۔ میجر فوجی ڈاکٹروں کے ساتھ گھر گھر گھوم کر اور عورتوں کے پیٹ چھو چھو کر اس وقت تک دیکھتا جب تک کہ اسے پوری طرح یقین نہ ہو جاتا کہ اس کی کوکھ میں......اس کے بعد ہی دوسرے گھر کی طرف قدم اٹھاتا۔ معائنے کا کام جب پورا ہو گیا تو ایک بار پھر ان کے چہروں پر فاتحانہ شیطانی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اس طرح اب نئی نسل دوغلی ہو جائے گی۔''

''نسل کشی کر کے ہم نے اس نسل کا سرے سے صفایا کر دیا ہے۔''

''اب کوئی دوسری قوم ہماری قوم کو کبھی بھی کسی مقام پر چیلنج دینے کی کوشش نہیں کرے گی، اور اگر کرے گی تو اس کا حشر بھی کچھ ایسا ہی......''اور پھر وہ سب کے سب خوشیوں بھرے راستوں پر قہقہے بکھیرتے ہوئے نسل کشی کی اپنی اس شیطانی مہم کو پورا

کر کے اپنی سرحدوں کی طرف لوٹ گئے۔

اور نئی نسل کی سرحدوں میں وہی عورتیں جو روندی، کچلی، مجبور اور بے بس تھیں، آنسو بہانے کے لئے باقی رہ گئیں۔۔ انہی آنسوؤں کی گہری چھاؤں میں وہ سب فوجیوں کے اس گھناؤنے فعل کے زہر کو اپنے اندر گھلتے ہوئے دیکھتی رہیں اور پھولتی رہیں......

ایسے وقت میں ہر عورت دوسری عورت سے آنکھیں چار کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن جب غم ایک تھا تو مل کر بانٹنا ہی تھا۔ اس غم کو کچھ کم کرنے کے لئے وقت سے پہلے ہی کچھ ایک عورتوں نے شیطان اولادوں کا گلا گھونٹ دینا چاہا تھا۔ کچھ ساہسی عورتوں نے پہل بھی کی۔

اس دوران عورتوں کی ایک تنظیم کا وجود کا عمل میں آیا۔ جس نے ایسا کرنے سے عورتوں کو پوری طرح روک دیا کہ۔۔

"اب ان کی اولادیں ہی ہماری جنگ کے کارگر ہتھیار ہیں۔"

پھر ایک ایک کر کے ساری عورتوں نے اپنے آنسوؤں کو اپنے آنکھوں میں ہی روک لیا۔

دائرہ پھیلتا رہا۔

اور ایک دن وقت کے پالنے میں بہت سارے بچے جھولنے لگے۔۔

اور پھر ان بچوں پر نظریں پڑتے ہی ماؤں کے چہروں پر ایک دبیز مسکراہٹ پھیلنے لگی تھی۔ کہ وہ سب تو...... اس لئے ان کی دیکھ بھال کچھ اس طرح سے کر رہی تھیں کہ اس لوہے میں زنگ لگنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

ہتھیار دو طرح کے تھے۔ لڑکا اور لڑکی۔ لڑکوں کے نام ان عورتوں نے اپنے شہید مردوں کے نام پر رکھے اور لڑکیوں کے نام پرانی قوم کی بیٹیوں کے ہم نام رکھ دئے۔ اس طرح ایک قوم دو حصوں میں منقسم ہو گئی جس کے یہاں لڑکے نے جنم لیا تھا۔ وہ نئی نسل کے ہی پیروکار رہے۔ لیکن جس گھر میں لڑکی کے پاؤں پڑے تھے۔ پرانی قوم کو اپنانے کی وجہ سے وہاں سب کچھ تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ رہن سہن، پوشاک، دھرم، زبان

اور......اور بہت کچھ......اور کچھ ویسا ہی اپنا لیا گیا تھا۔

لوگ ہتھیار چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ لیکن ماؤں نے اپنی بیٹیوں کو کھلی فضا میں پرواز کرنے کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا۔ فیشن ان لڑکیوں کے پیروں سے جب ایک بار شروع ہوتا تو سر پر ہی جا کر ختم ہوتا تھا۔ مائیں اپنے بیٹوں کو اپنے ذریعے بنائی گئی عبادت گاہوں میں لے جایا کرتیں۔ لڑکیوں کے ہوش سنبھالنے سے قبل ہی کتابوں کے ذریعے انہوں نے جو کچھ سیکھا تھا، بڑا ہونے پر اس کی روشنی میں انہیں مذہب کا گیان دیتیں۔ لڑکیوں کے روبرو کبھی نئی قوم کا ذکر نہ کرتیں۔

لڑکیاں عمر کی سیڑھیاں تیز رفتاری سے چڑھتی رہیں----

لڑکوں کے قدم اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے رہے------

مائیں آپس میں ملتی رہیں......

باتیں ہوتی رہیں......

تنظیم گھوم گھوم کر اپنا کام کرتی رہی......

اخبار ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع سے درندہ صفت میجر اور شیطان فوجیوں تک من چاہی خبریں پہنچائی گئیں۔ سب کچھ پکا پکایا تھا۔ اس لئے راکھ کے اندر چھپی چنگاریوں کو صرف ہوا دینا تھی۔

بچوں کے سامنے مائیں کھڑی تھیں----

"تم پوچھا کرتے تھے ناں کے تمہارا باپ کون ہے۔؟ کیا نام ہے۔؟ اور اب کہاں ہے۔؟ اور ایک دن ہم نے تمہیں بتایا تھا کہ شہر کے سارے مرد مذہب کی تبلیغ کے لئے دوسرے ملک جا رہے تھے کہ سمندر میں ایک بھیانک طوفان آ گیا اور کشتی...... لیکن اب جب کہ تم لوگ بڑے ہو چکے ہو اس لئے وہ راز......"

"اب تم ہی نسل کشی کی اس جنگ میں ہمارے ہتھیار ہو۔"

میڈیا کے ڈھولکی، میڈیائی ڈھولک کے ذریعے پرانی قوم کے گھر گھر مرچ مصالحے سے بھری ہوئی ان کی بیٹیوں کی سرخ اور رنگین خبریں پہنچانے کا کام بڑی مستعدی کے

ساتھ انجام دے رہے تھے۔ جو پرانی قوم کے لئے باعثِ شرم اور توہین آمیز تھیں۔ ان میڈیائی خبروں کی وجہ سے اب وہ ساری دنیا میں سر اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔

میڈیائی ڈھولکی کی تھاپ بدستور جاری تھی۔

اب ہر روز اخبار کے پہلے صفحے پر ایک نئی اور انوکھی شادی کی خبر حاشیے کی زینت بنتی۔ جس میں سب سے خاص بات یہ ہوتی کہ لڑکی کے والد کے نام کی جگہ پرانی قوم کے انہی فوجیوں میں سے کسی نہ کسی کا نام ہوا کرتا۔ اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ کچھ کے پتے بھی شامل رہتے۔

اس طرح شادی کی خبریں سالہا سال اخباروں میں، ریڈیو میں، ٹیلی ویژن میں جگہ پاتی رہیں۔ ان خبروں کی اشاعت و تشہیر سے جنرل میجر، اس کے دیگر سربراہ اور فوجیوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے تھے۔ قوم کی بدنامی ہو رہی تھی۔ کچھ اپنے بھی لعنت ملامت کر رہے تھے۔ اور دوسرے تو طنز کے تیر پھینک ہی رہے تھے۔ ایسے میں میجر اور ان کے ریٹائرڈ فوجی اندر ہی اندر ٹوٹنے اور بکھرنے لگے تھے۔ اپنی قوم کی عزت کو لے کر یہ لوگ معاملے کو عدالت تک لے گئے۔ لیکن عدالت نے بھی دو ٹوک فیصلہ سنا دیا "سن بلوغت کے بعد......" اس لئے وہ سب کے سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

اور ایک دن صبح کا اخبار چائے کے ہمراہ جنرل میجر کے سامنے تھا۔ پہلے ہی صفحے کی دیوار پر شادی کی ایک دھماکہ خیز سرخی ٹنگی تھی۔ وہ بالکل چونک گیا۔ لڑکی کا نام اس کی بیٹی کا تھا۔ ایک نام تو کئی ایک لڑکیوں کے ہو سکتے ہیں۔ اس خیال کے ابھرتے ہی اس نے ذہن کی دیوار پر جمی ہوئی شک و شبہات کی کائی کو جیسے ہی کھرچ کر الگ کرنے کی کوشش کی کہ اچانک باپ کے نام پر نظر پڑ گئی۔ وہ اندر سے بری طرح کپکپا گیا۔ ہاتھ سے پیالی کے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے ٹکڑوں سے نظریں ہٹتے ہی اس نے ایک بار پھر باپ کے نام کو پڑھنا چاہا۔ نام تو اسی کا تھا۔ اور پتہ۔ پتہ بھی اس کے ہی گھر کا تھا۔ آنکھیں ڈبڈبا اٹھیں......

"ارے کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"؟ بیوی خالی ٹرے سنبھالے حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"لیکن ہماری بیٹی کہاں ہے؟" نہ چاہتے ہوئے بھی سر اسی طرح جھکائے اس نے پوچھ لیا تھا۔

"وہ! ارے لو ......" پیالی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو ٹرے میں چنتے ہوئے بولی۔ "تم کل دیر رات کلب سے لوٹے تھے۔ اس لئے بتانا بھول گئی۔ ارے کیا نام ہے اس کا۔؟ جس کا چہرہ بالکل تمہاری طرح ہے۔ کل رات اس کی شادی تھی۔ وہ اس کے ساتھ اس کے ہی گھر گئی ہے۔"

میجر کی ڈبڈبائی آنکھیں، تعفن اور سڑاند سے بھری ہوئی نسل کشی کی بیس سالہ پرانی دلدل میں دور تک دھنستی چلی گئیں۔

☆☆☆

تخلیق

اس کمہار کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیاں، مورتی کلا کی دنیا میں کافی داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ وہ پہاڑ کی اوپر چوٹی کے ایک ایسے غار میں مورتیاں بنایا کرتا ہے جہاں سورج کی کرنیں پہنچنے سے قبل ہی دم توڑ دیتی ہیں۔

اس کمہار نے اپنے برسوں کی محنت و ریاضت کو بروئے کار لا کر ایک دن جب ایک شاہکار کی تخلیق کی تو وہ اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ خوشی کے مارے کمہار نے اسے چوم لیا۔ اس مورت نے اندھیرے میں ہی اپنے تخلیق کار کو دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن دیکھ نہیں پائی۔ تب وہ اندھیرے میں غار کا چکر لگانے لگی۔ چکر لگاتے لگاتے تھک گئی۔ لڑکھڑائی۔ ٹھوکر لگی۔ وہ گری اور رونے لگی۔ رونے کی آواز پہ کمہار دوڑتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

"رو کیوں رہی ہو تم۔؟"

"دیکھتے نہیں کہ میرے پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔ کب تک ہم اندھیرے کی مار کھاتے رہیں گے۔ تم کہتے ہو کہ میں تمہارا شاہکار ہوں۔ تو کیا مجھے بھی لائن لگ کر اپنی باری

کاانتظار کرنا پڑے گا۔ مجھ پر ترس کھاؤاور مجھے اس اندھیرے سے باہر نکالو۔ روشنی کی دنیا تمہارے اس شاہکار کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہے۔"

"اس مورتی کی دنیا کے شاہکار کے بھی اپنے کچھ اصول ہیں۔ تم شاہکار ہو یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے باوجود تمہیں دوسروں سے پہلے روشنی کی دنیا میں بھیج کر میں اپنے قانون کا گلا نہیں گھوٹ سکتا۔ ویسے تمہاری باری کے آنے کا مجھے بھی انتظار ہے۔"

"لیکن کیوں۔؟"

اس لئے کہ تم میرا شاہکار ہو۔ روشنی کی دنیا میں تمہارے پہنچتے ہی چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ میرا فن آسمان کو چھولے گا۔ ہر طرف ہمارا ہی چرچہ رہے گا۔؟؟"

تمہارا تو ہوگا ہی۔ اس لئے ایک تخلیق کار جہاں اپنی تخلیق سے پہچانا جاتا ہے وہیں ایک تخلیق یہ بتاتی ہے کہ اس کا تخلیق کار کیسا ہوگا۔"

اس کمہار نے بے شمار مورتیاں بنائی تھیں۔ آکاش پہ اگے تاروں کی مانند۔ وہ ساری مورتیاں اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہی ہیں کہ کوئی اسے بھی لینے کے لئے آئے گا۔ پسند کرے گا اور وہ پہاڑ کی تاریک چوٹی سے سرک کر روشنی کی دنیا میں چلی آئے گی۔ مسکرائیگی۔ ناچے گی۔ گائے گی اور.........

لیکن آج جب شاہکار مورت کی باری آئی تو اس نے پہلے خریدار کے ساتھ روشنی کی دنیا میں جانے سے صاف انکار کر دیا۔

"میں اس رنگ برنگی دنیا میں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں۔؟" کمہار کو اپنے شاہکار کے اس انکار سے کافی جھٹکا لگا۔

"اس لئے کہ اندھیرا ہی میرا گھر ہے۔" مورت نے اندھیرے غار کے اس کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں اس کا وجود عمل میں آیا تھا

"لیکن تم بھول رہی ہو کہ اس اندھیرے گھر کا مالک میں ہوں۔ تمہیں جس کے ساتھ اور جہاں کہیں بھی بھیجوں گا، وہاں تمہیں جانا ہی پڑے گا۔" کمہار نے بحث کی ترازو

کے ایک پلڑے میں اپنی بات کے وزنی بٹکھرے کو رکھتے ہوئے مورت پہ دباؤ ڈالا۔

"میں کسی بھی حال میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" مورت نے بھی انکار کا ایک اور بٹکھرا اچھا کر پلڑا برابر کر دیا۔

"یہاں تمہاری نہیں، میری مرضی چلے گی۔"

"اگر ہمیشہ خالق کی مرضی چلی ہوتی تو آدم اور حوا گندم کھانے کا گناہ کبھی نہیں کرتے۔"

"نافرمان مورت! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا جنم میرے وجود سے ہوا ہے۔ تم سے قبل کتنی ہی مورتیاں وہاں جا چکی ہیں اور ابھی نہ جانے کئی اور مورتیاں میرے وجود سے نکل کر وہاں جانے کی آس میں اپنی آنکھیں بچھائے بیٹھی ہیں۔"

"میرے آقا! مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ پھر بھی میں آج اپنی گستاخی سے باز نہیں آؤں گی۔"

"گستاخ مورت! تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ جو مورت تیرے پیچھے کھڑی ہے وہ تمہارے اس انکار سے کتنی خوش ہے۔ اگر تم نہیں جاؤ گی تو اسے روشنی کی دنیا میں بھیج دیا جائے گا۔ محلوں کی زینت بننے ....

"میرے خالق! میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ مجھے روشنی کی دنیا سے کوئی مطلب ہے اور نہ ہی محلوں کی زینت کا کوئی شوق ......"

"دیکھو ابھی بھی وقت ہے سوچ لو۔" کمہار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تاریکی میں رہ کر تمہارا وجود بھی اتنا تاریک ہو جائے گا کہ ایک دن تاریکی تمہیں اپنے وجود کا حصہ سمجھ کر اپنے میں ضم کر لے گی۔ تب تم اپنے وجود کے لئے۔ اپنی شناخت کے لئے چیخو گی۔ تاریکی سے نکل کر بھاگنے کے لئے روشنی ڈھونڈو گی، لیکن سورج اس وقت تمہارے وجود سے اتنا دور ہو گا کہ تم اپنے وجود کو نہ دیکھ پاؤ گی اور نہ ہی کبھی خود کو پہچان سکو گی۔ اس لئے میری بات مان لو اور ......"

کمہار کی باتوں پہ مورت کے چہرے پہ طنزیہ تبسم کی لکیر نمودار ہوئی جو دیکھتے ہی

دیکھتے تاریکی میں گم ہو گئی۔

"دیکھو میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ تم اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہ تمہیں اپنی عمارت کے خوبصورت گوشے میں سجا کر رکھے گا۔ تم جب اس چمکتی ہوئی دنیا کو دیکھو گی تو اس تاریک دنیا کے خیال سے ہی کانپ اٹھو گی۔"

"فی الحال میں روشنی کے وجود سے کانپ رہی ہوں۔" مورت نے اپنی کپکپاہٹ پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے بھیجنا ہے تو کسی ایسی جگہ بھیجئے جہاں سرخ سورج نہ اگتا ہو۔ جس کے چاروں طرف خشکی ہی خشکی ہو۔"

"نہیں! میرے نقشے میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ روشنی کی دنیا میں تین حصہ پانی ہی پانی ہے۔" کمہار نے بے بسی کا اظہار کیا۔ "جہاں تین حصے پانی ہی پانی ہوں، وہاں اس مٹی کی بے جان مورت کا کیا کام۔ مجھے یہیں اپنے پاس کسی کام میں رکھ لیجئے۔ میں مٹی گوندھنے اور مورت بنانے میں آپ کی مدد کروں گی۔ لیکن روشنی کی اس دنیا میں کبھی نہیں جاؤں گی۔"

کمہار نے اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اور اس کی دلکشی کے لئے دنیا کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا۔

"وہاں سورج نکلتا ہے تو پہاڑوں کی چوٹیاں اور سمندر کی سطحیں سنہری ہو جاتی ہیں۔ پہاڑوں کے وجود سے چمٹی برف کی چٹانیں جب اپنے اندر سورج کو اترتے ہوئے ، یکھتی ہیں تو کپکپاہٹ کے مارے اس کے جسم سے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ یہی پسینہ جب پہاڑوں کی چوٹیوں سے سرک کر نیچے اترتا ہے تو ندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور کھیت کھلیان مسکرانے لگتے ہیں۔ ہرے بھرے درختوں پہ جب پرندے چہچہاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے باغ ارم میں بلبل نغمہ سرائی کر رہی ہو۔ جب سرد ہوائیں خراماں خراماں چلتی ہیں تو بدن گلابی ہو جاتا ہے۔ گلاب کی نکہت جب ہواؤں کے ساتھ سفر کرتے کرتے سورج تک پہنچتی ہے تو آسمانی افق پر شفق کے بادل تیرنے لگتے ہیں۔ شفق کا سرمئی آنچل جب سورج کے سر پہ لہراتا ہے تب سرمئی غبار پورے آکاش کو اپنے حصار میں قید کر لیتا ہے اور جب شب اپنا سیاہ دامن پھیلاتی ہے تو اس کے بدن پہ بے شمار ستارے ٹانک دیے جاتے ہیں۔ چاند اس کی

پیشانی سے ابھر کر ساری رات سیاہ زلفوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہے۔ کبھی اپنی نرم چاندنی سے بھٹکے ہوئے راہی کی رہنمائی کرتا تو کبھی شوخ کرن بن کر محبت کرنے والوں کے دلوں میں اتر جاتا ہے۔روشنی کی یہ دنیا سات رنگوں کا ایک حسین مجموعہ ہے۔"

"واقعی !تب تو وہ جگہ بہت حسین ہو گی۔"مورت نے اپنا چہرہ دوسری طرف گھماتے ہوئے کہا۔ جنت سے بھی زیادہ۔"

"تو پھر تمہارا ارادہ۔!"؟کمہار اس کے سامنے چلا آیا۔

"ارادہ۔!"مورت کی طنزیہ مسکراہٹ ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پہ آکر بکھر گئی۔ کمہار اس کی اس ادا پر جھلا اٹھا۔

"تو اس وقت تمہاری زبان تمہارے حلق سے نیچے کیوں اتر گئی تھی۔جب تمہیں بنانے کے لئے مٹی گوندھ رہا تھا۔؟"جب میں نے تمہارا ڈھانچہ بنایا تھا،روشنی کے بارے میں بتایا تھا تو تم نے کیوں نہیں پوچھا تھا کہ روشنی کیسی ہوتی ہے۔؟جب تمہارے سامنے روشنی رکھ کر سات رنگوں کے حسین امتزاج سے تجھے شاہکار کا روپ دے رہا تھا تو تمہاری آنکھیں اتنی چمک کیوں رہی تھیں۔؟"کمہار نے اس طرح کے اور کئی سوال کر کے مورت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"تو پھر تمہارا یہ خوبصورت وجود کیسے عمل میں آتا۔ تم خود بھی پانی سے بنی ہو اور پانی سے ہی ڈرتی ہو۔"

مورت کچھ توقف کے بعد بولی۔"آپ میرے مالک، خالق سب کچھ ہیں۔ آپ نے ہی مجھے مٹی سے مورت کا روپ دیا۔ مجھ جیسی بہت سی مورتیوں کو عزت دی۔ شہرت دی۔ کسی کو چوراہے پہ بٹھایا تو کسی کو پارک میں۔ کسی کے اوپر ہار چڑھوائے تو کسی کو بھگوان کا روپ دے کر پانی کے حوالے کیا۔اور......"مورت کی بات کو بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے کمہار نے کہا۔

"تم پانی سے اتنا کیوں ڈرتی ہو۔؟پانی تو ہماری زندگی ہے۔پانی اگر نہ ہوتا تو میں مٹی ہی نہیں گوندھ پاتا۔اور اگر ایسا ہے تو میں تمہارے اوپر ایک ایسا رنگ چڑھادوں گا جس پر نہ

کسی طوفان کا اثر ہو گا اور نہ ہی کسی سیلاب کا۔"
"نہیں مجھے ایسی بے حس زندگی نہیں چاہیے کے کوئی کچھ بھی کرے اور مجھے پتہ تک نہ چل سکے۔"
"تو پھر تمہیں چاند ستاروں کی دنیا سے کس زمانے کا بیر ہے کہ تم وہاں......"
کمہار کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی مورت نے جواب دے دیا۔
"وہاں ہر شئے کا وجود روشنیوں کے حصار میں قید ہے۔ مجھے تاریکی نے جنم دیا۔ اس لئے تاریکی مجھے عزیز ہے۔"
"بس کچھ ہی عرصے کی بات ہے۔ ہر کسی کو یہاں ایک معین مدت کے بعد تاریکی کی قبر میں دفن ہو جانا ہے۔" کمہار نے اس کے وجود پر حقیقت کی روشنی ڈالی۔
"اگر ایسا سب کے ساتھ ہونا ہے تو پھر میں روشنی سے دوستی ہی کیوں کروں۔ بچھڑتے وقت بہت تکلیف ہو گی۔ اس لئے میں ابھی سے تاریکی کی اس قبر میں خود کو دفن کرنا چاہتی ہوں۔"
"تم ضد چھوڑ کر میری بات مان لو۔ اور روشنی کی دنیا میں جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ میرا آخری حکم ہے۔ اگر اس کے بعد بھی تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تمہارے حسین چہرے پہ کالک پوت کر اپنے سے بہت دور کر دوں گا۔" کمہار نے اپنا آخری پتا بھی مورت کے سامنے پھینک دیا۔
"تم خالق ہو کر اپنے شاہکار کے ساتھ ......"؟ مورت نے سوالیہ نظروں سے کمہار کی طرف دیکھا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔"
"حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ میں اس سے بھی گھناؤنا سلوک کر سکتا ہوں۔" کمہار نے اپنے ہاتھوں میں ہتھوڑا اور چھینی اٹھاتے ہوئے کہا۔
مورت گھبرا گئی۔ "ویسے میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر تم مان جاؤ گے تو میں تمہیں یہ سب کچھ جو ابھی بتانے جا رہی ہوں، کبھی نہیں بتاتی۔ لیکن تم نے مجھے اپنی نظروں سے اتنا گرا دیا ہے کہ میں اب سچائی آشکار کرنے پر مجبور ہوں۔"

''سچائی۔ مجبوری۔ آخر یہ سب ہے کیا۔؟'' کمہار نے اپنی جھنجلاہٹ پہ قابو پاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''سچائی یہ ہے کہ آج بھی مجھے روشنی سے بے انتہا پیار ہے۔ مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے خالق سے والہانہ عقیدت رکھتی ہوں۔'' مورت کے ایک ایک لفظ سے اپنائیت کی شیرینی ٹپک رہی تھی۔

''پیار۔ عقیدت۔؟'' کمہار کی حیران آنکھیں مورت کے سامنے جب پوری طرح سے پھیل گئیں تب مورت نے اپنی نظریں جھکالیں۔

''جب میرا خالق میری تخلیق کرنے کے لئے اپنی ساری زندگی تاریکی کی نذر کر سکتاہے تو کیا میں اس خالق کی شاہکار تخلیق ہو کر اپنی پوری زندگی تاریکی کے حوالے نہیں کر سکتی؟''

مورت کی ان فلسفیانہ باتوں میں کمہار کو کافی دم نظر آیا۔ اس نے خریدار کے سامنے ہاتھ جوڑ لئے۔

ساری زندگی میں نے مورت کی تخلیق کی ہے۔ لیکن آج ایک مورت نے اپنی ساری زندگی تاریکی کی نذر کر کے ایک بار پھر میری تخلیق کی ہے۔ اس لئے میں اپنے تخلیق کار کا سودا نہیں کر سکتا۔''

مورت نے خوشی سے کمہار کا چہرہ چوم لیا۔

☆☆☆

انگڑائی

"نہیں دیدی، نہیں! مجھ سے یہ دھندا نہیں ہوگا۔" پدما ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔
"کیا کہا، نہیں ہوگا۔؟" بال پکڑ کر روپ وتی نے اسے بری طرح سے جھنجھوڑ دیا۔
"کیا اس کام کے لئے ہی مجھے تم یہاں لائی ہو دیدی۔؟"
"نہیں تو کیا انڈے دینے آئی ہو۔؟"
"نہیں دیدی، نہیں! مجھ سے یہ......" موقع ملتے ہی پدما نے اپنے بال چھڑائے اور روپ وتی کو ایک طرف ڈھکیلتے ہوئے دروازہ کی طرف دوڑ پڑی۔ روپ وتی گرتے گرتے سنبھل گئی تھی۔ اس لئے وہ فوراً اس کے پیچھے تیزی کے ساتھ لپکنے میں کامیاب ہوئی اور اس کی چوٹی پکڑلی۔ پھر غصے میں اس نے پدما کے نمکین گالوں پر زوردار طمانچہ جڑدیا۔
"رنڈی بھاگتی کہاں ہے۔؟ پیر پکڑ کر توڑ دوں گی۔"
"نہیں بھگوان کے لئے مجھے جانے دو۔"
"حرامی کہیں کی۔ باپ رنڈیوں کے ساتھ دن رات سویا رہتا تھا اور بیٹی چلی شریف زادی بننے۔"

تھوڑی دیر تک پدما اپنے گالوں کو سہلاتی رہ گئی تھی۔ کچھ سوچتے سوچتے بڑی ہمت بٹور کر پھر بولی۔ "دیدی! کیا تم مجھے کوئی دوسرا کام نہیں دے سکتیں۔؟"

"دوسرا کام۔؟" روپ وتی کی ایک زوردار لات ہوا میں لہرائی اور پدما چاروں خانے چت ہو گئی۔ جیسے ہی اٹھنے کی کوشش کی اوپر سے ایک اور لات۔ "بولو دھندا کرو گی کہ نہیں۔؟"

"نہیں دیدی۔ بھگوان کے لئے چھوڑ دو مجھے۔" پدما اس کے پاؤں پکڑ کر گڑگڑاتی رہی۔

"رنڈی کہیں کی۔ چھوڑ دیں تمہیں۔ پھر جو تمہارے مکان مالک کو چکتا کیا ہے وہ کون چکائے گا تمہارا یار۔؟"

"دیدی! میں کہیں سے بھی کچھ کر کے تمہیں......"

ایک بار پھر روپ وتی کی لات ہوا میں لہرائی۔ پدما پر مکے کی بارش ہوتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ادھ مری سی ہو گئی۔

"بولو! تم دھندہ کرو گی کہ نہیں۔؟" روپ وتی اس طرح سے اسے پیٹ رہی تھی کہ پدما سے رہا نہیں گیا۔

"دیدی میں تیار ہوں۔ اب مت مارو مجھے۔ مت مارو مجھے۔"

پدما کے منہ سے "ہاں" سنتے ہی روپ وتی نے اسے چھوڑ دیا۔ چھوڑتے ہی پدما لڑکھڑاتے ہوئے آہستہ آہستہ اٹھی اور دوڑتے ہوئے روپ وتی کے سینے سے چمٹ گئی۔ چمٹتے ہی روپ وتی کے کانوں میں دور بہت دور سے آتی ہوئی اس کی چھوٹی بہن کی آواز 'دیدی۔ دیدی' ٹکرانے لگی۔

"پگلی روتی کیوں ہے۔؟ میں ہوں نا۔" روپ وتی بھی اس سے اسی طرح چمٹ گئی۔

"دیدی اب مارو گی نہیں نا۔ دیکھو کتنا خون بہہ رہا ہے میرے ماتھے سے۔"

"مت رو پگلی! چپ ہو جا۔" بہتے ہوئے خون کو روپ وتی اپنے آنچل میں پوچھتے

ہوئے بولی۔ ”ایک دیدی کبھی اپنی چھوٹی بہن سے یہ سب کچھ بھی کروا سکتی ہے۔؟“
روپ وتی نے جب زور سے اسے گدگدایا تو پدما اس کے بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر یکایک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”لیکن پدما، تمہیں جینے کے لئے کچھ نہ کچھ تو ......“

”میں اس سے بھاگ کہاں رہی ہوں دیدی۔؟“

”کچھ کام وام بھی آتا ہے۔؟“

وہ بالکل بچوں کی طرح بولی۔ ”جیسے جھاڑو لگانا، کپڑے دھونا، برتن مانجھنا، کھانا بنانا، بچہ کھلانا، اور ......“

”ارے پگلی! اس کے علاوہ بھی کوئی کام آتا ہے تمہیں۔؟“

”ارے لو دیدی! اصل بات تو کہنا بھول ہی گئی۔ تھوڑا بہت سلائی ولائی کا کام کام آتا ہے مجھے۔“

”اچھا۔ تو پھر اب سوچنا کیا؟ دو چار سلائی سنٹر کا پتہ دوں گی۔ کسی نہ کسی کو تمہاری ضرورت ہوگی۔ وہ تمہیں رکھ لیں گے۔“

وہ سب ٹھیک ہے دیدی۔ لیکن میں رہوں گی کہاں۔؟“

”دیدی کہتی ہو اور پوچھتی ہو رہوں گی کہاں۔؟“

زمانے کے اس عجیب و غریب چکر نے پدما کو، ایک نامی طوائف کے ساتھ تیسری منزل کے ایک ہی گھر میں رہنے کے لئے مجبور کیا تھا۔ سیڑھی سے ہو کر گزرنے پر جو کمرہ پہلے آتا تھا وہ روپ وتی کا تھا اور اس سے بالکل ملا ہوا کمرہ پدما کا۔ دونوں کمروں کے بیچ ایک دروازہ تھا۔ دھندے کے وقت دروازہ بند رہتا تھا۔

قریب پانچ سال سے روپ وتی اس مکان میں رہ رہی تھی۔ دھندا اس نے یہیں شروع کیا تھا اور تب سے پدما کا باپ اس کا مستقل گاہک تھا۔ سڑک حادثے میں اس کی موت ہوئی تو روپ وتی اس کے گھر گئی۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا تھا کہ پدما کا اب سنسار میں کوئی نہیں ہے۔ ماں کو مرے ہوئے بھی ایک عرصہ ہو گیا ہے تب اکیلی لڑکی کو دیکھ کر روپ وتی

سے رہا نہیں گیا۔ ایک تو وہ جوان تھی اور اس کے نین نقش بھی کافی تیکھے تھے۔ اس لئے وہ اس امید پر اس کے گھر جانے لگی کہ دھندے میں اگر کام آگئی تو ڈھلتی عمر کا وہ ایک بہت بڑا سہارا بن جائے گی۔

پدما کا گھر کرائے کا تھا۔ کئی ایک ماہ سے شراب نے اس کے باپ کو گھر کا کرایہ ادا کرنے نہیں دیا تھا۔ اس حادثے کے بعد مالک مکان نے جب گھر خالی کرنے کے لئے کہا تو اس کے نیچے کی دھرتی ہلنے لگی تھی۔ ایسے دور میں رشتہ داروں نے بھی آنا جانا بند کر دیا تھا اور جانے ، انجانے ہو گئے تھے کہ جوان لڑکی کو گھر لے جا کر آج کے اس لالچی دور میں شادی بیاہ کا بوجھ کون اٹھائے گا۔ ؟۔ اس وقت روپ وتی ہی کام آئی تھی۔ وہ اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی۔ لیکن جب پدما کو معلوم ہوا کہ وہ ایک نامی طوائف ہے تو اسے گھن سی محسوس ہوئی تھی۔ اور جب روپ وتی نے پدما سے پیار بھرے انداز میں کہا تھا۔ ”اب تم میرے ساتھ میرے کام میں ہاتھ بٹاؤ گی۔“ تو اس وقت پدما کی آنکھوں میں غصے کی لالی دوڑ گئی تھی۔ لیکن پھر اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا کہ اس سنسار میں جہاں اپنوں نے تجھے دھتکارا ہے ، وہیں اس طوائف نے تجھے ...... اگر یہ نہیں ہوتی تو پھر ...... پھر وہ سنبھل گئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”نہیں دیدی نہیں! مجھ سے یہ دھندا نہیں ہو گا۔“ پدما ہاتھ جوڑے روپ وتی کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

پھر اس کے ایک ہفتہ بعد ہی پدما کو ایک جگہ کام مل گیا۔ اس شام وہ خوشی خوشی گھر لوٹی تھی۔ روپ وتی پکوڑے بنا کر اس کی راہ بڑی بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ آتے ہی پدما نے اسے اپنے کام کے بارے میں بتایا اور روپ وتی نے اس کے جواب میں اسے گرما گرم پکوڑے کھلائے۔

”دیدی! کیا تم یہ دھندا نہیں چھوڑ سکتیں۔ ؟“ پکوڑے کھاتے کھاتے وہ بول پڑی تھی۔

”کیوں! کیا ہوا ہے تمہیں۔ ؟“

"نہیں، کچھ نہیں دیدی! بس وہ کیا ہے دیدی کہ سینٹر کا مالک مجھے سمجھانے کے بعد پوچھ بیٹھا تھا۔ "تمہارے گھر پر اور کون کون ہیں؟" میں نے بتایا کہ میری ایک دیدی ہے۔ "لیکن جب اس نے پوچھا کہ۔ کیا کرتی ہیں تمہاری دیدی۔؟ تو جانتی ہو دیدی! اس وقت میرا چہرہ شرم سے جھک گیا تھا۔ شرمندگی کو چھپانے کے لئے میں فوراً جھوٹ بول پڑی تھی کہ میری دیدی بھی گھر پر سلائی کا کام کرتی ہیں۔"

"پگلی! کیا تم سوچتی ہے کہ مجھے یہ دھندا اچھا لگتا ہے۔؟"

"تو پھر تم یہ چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔؟"

"اچھا تو اگر مجھے تھوڑا بہت سینا دینا سکھا دے تو میں یہ کام بھی کرلوں گی۔"

"دیدی! تو نے آج میرے دل کی بات چھین لی۔ ڈرتی تھی کہ کہیں کچھ کہوں اور تمہیں برا لگ گیا تو۔" کچھ رک کر۔ "دیدی اب میں تمہیں جی جان سے سکھاؤں گی۔ کل اپنا بھی ایک سلائی سینٹر ہوگا۔ کیسا رہے گا تب دیدی۔؟"

"اچھا رہے گا۔ لیکن جانتی ہو پدما! مشین کے لئے پیسے چاہئیں۔ پیسے کی مشین تو میرا دھندا ہے۔ جب کل پیسے ہو جائیں گے تو دیکھا جائے گا۔"

"دیکھا نہیں، بلکہ......؟"

"اچھا بابا اب سو بھی جاؤ۔ بہت تنگ کر چکی مجھے۔" روپ وتی کی اس بات پر دونوں ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنسیں اور اپنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

وقت انگڑائی پر انگڑائی لیتا رہا.........

روپ وتی اور پدما میں آہستہ آہستہ کافی گہری دوستی ہو گئی۔ رات کے درد سے چور چور روپ وتی اکثر صبح دیر سے اٹھتی اور ناشتہ اور دوپہر کا کھانا، سنٹر جانے سے پہلے ہی پدما ہنستے کھیلتے بنا لیتی۔ شام ڈھلے جب کام سے پدما تھکی ہاری گھر پہنچتی تو اسے آرام کا پورا موقع دے کر روپ وتی چولہے کے سامنے بیٹھ جاتی۔ رات کے کھانے کے وقت دونوں ایک دوسرے کو اپنی رام کہانی سناتیں۔

"کل وہ میرا پھر آیا تھا۔"

"کون دیدی۔؟" پدما ان دنوں اس طرح کی باتوں کو بڑے چاؤ سے سننے لگی تھی۔

"وہی جس کے بارے میں، میں کہا کرتی ہوں کہ بہت اچھا لگتا ہے مجھے...... !"

"اچھا وہی سنہرے بالوں والا۔؟" پدما ہنس پڑی تھی۔

"ہاں وہی! بہت پیار کرتا ہے مجھے۔ جب بھی آتا ہے ایک عجیب سی خوشی دے جاتا ہے۔ اس کے ساتھ سوتے ہوئے مزا آجاتا ہے۔ بہت مزا دیتا ہے وہ مجھے۔ میں تو ہر رات یہی پرارتھنا کرتی ہوں کہ وہی آئے۔"

"اچھا ایسی بات ہے دیدی۔؟"

ہاں رے پدما۔ نہ جانے کتنے گر جانتا ہے وہ یہ سب کچھ کے۔ انگ انگ توڑ کر رکھ دیتا ہے میرا......"

"اچھا! پھر بھی وہ پیارا ہے۔؟"

پدما دھندا بدلنے کے لئے روپ وتی کو کئی بار کہہ چکی تھی۔ اس لئے آج سینٹر سے لوٹتے ہی اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور دوٹوک لفظوں میں اپنی دیدی سے پوچھے گی۔

"تم یہ دھندا چھوڑو گی یا نہیں دیدی۔"

"بابا کتنی بار کہا نا کہ چھوڑ دوں گی۔"

"لیکن کب دیدی۔؟"

"بہت جلدی پگلی۔"

"پرومس دیدی۔!

آج کی رات پدما کھانا کھا کر بستر پر گری تو روپ ورتی کی سحر انگیز باتیں اسے ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں ...... ایک ایک لفظ بوند بوند بن کر اس کی شریانوں میں اترنے لگا تھا۔ تب اس کے اندر ایک ہلچل سی برپا ہو گئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ رات کی میٹھی نیند نے پہلی بار اس سے منہ پھیر لیا تھا۔ اس لئے اس رات جیسے ہی سیڑھیوں پہ کھٹ کھٹ کی آواز ابھری۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ دروازے پہ دستک کیا ہوئی کہ وہ سنبھل کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے اس کے ہی دل کے دروازے پر کسی نے دستک دی ہو۔ دروازہ کھلنے کی آواز

پدما پلنگ سے جیسی ہی اتری۔ دروازے کے پاس پہنچ کر دروازے سے بالکل لگ کر وہ ایسے کھڑی ہو گئی جیسے وہ بھی دروازے کا ہی ایک حصہ ہو، کان لگا کر اندر کی باتوں کو وہ اس وقت تک سنتی رہی جب تک پرندوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ دروازہ کھلنے کی آواز نہ ہوئی اور کھٹ کھٹ سیڑھیاں نہ اتر گئی۔

پھر کچھ ہی دنوں کے بعد دونوں نے مل کر ایک سکنڈ ہینڈ مشین کی خریداری بھی کر لی۔ اس لئے اب ہر روز پدما اسے کچھ نہ کچھ سکھانے بھی لگی تھی۔ شروع شروع میں روپ وتی کا دل کام میں نہیں لگتا تھا۔ کبھی دل رہا تو کیا اور کبھی نہیں والی بات تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے کافی کچھ سیکھ لیا۔

ادھر روپ وتی کے کمرے میں جب تک گاہک رہتا پدما دروازے سے لگی رہتی۔ رات کی تاریکی میں ابھرنے والی ننگی آوازیں اسکے کانوں میں ٹپ ٹپ شہد ٹپکاتی رہتیں۔ تب اس کے اندر کوئی چیز انگڑائی پر انگڑائی لینے لگتی۔ مدہوشی کی ایک پراسرار کیفیت اس کے اوپر طاری ہو جاتی۔ ایسے میں وہ بجلی کی چمک اور کڑک کے اصولوں پر چل کر ننگی آوازوں سے بہت آگے نکل جانا چاہتی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ہوتی۔

چھٹی کے دن روپ وتی کے ساتھ پدما کو بھی مارکیٹ جانا تھا۔ لیکن ننگی آوازوں سے آگے نکل بھاگنے کی چاہ نے بہانہ بنایا اور بہانے نے اسے روک لیا۔

"نہیں تمہارے پیٹ میں جب درد ہے تو مت جاؤ۔ میں اکیلے ہی مارکیٹ کر لوں گی۔"

روپ وتی کے گھر سے نکلتے ہی پدما نے سیڑھی کے دروازے کو بند کیا۔ چولہا جلایا۔ پنکھے سے جھل کر اس کے منہ کو سرخ کیا۔ اور سینچے کے نوکیلے حصے کو آگ کے اندر قریب دو تین انچ ڈال کر............ کئی بار یہ عمل دہرایا گیا۔ تب کہیں جا کر پدما دروازے میں ایک ایسی جگہ سوراخ بنانے میں کامیاب ہوئی، جہاں سے وہ روپ وتی کا بیڈ آسانی سے دیکھ سکتی تھی۔ ایسا کرنے میں اسے بڑا مزہ آیا تھا لیکن اس عمل کے دوران پسینے پسینے ہو گئی تھی اس لئے فوراً اسے نہانا پڑا تھا۔

اس رات کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ پدما دروازے کے پاس پہنچی۔ سوراخ پر آنکھ رکھتے ہی وہ خوشی سے اندر ہی اندر جیسے اچھل پڑی تھی۔ وہی سنہرے بالوں والا روپ وتی کا شہزادہ اس کے سامنے تھا۔ روپ وتی نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اسے پدما اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔

پھر ہر رات کا یہی معمول ہو کر رہ گیا۔ کھٹ کھٹ کی آواز پر چونکنا، دستک پر اٹھنا، سوراخ میں آنکھ رکھ کر لذت میں ڈوبی ہوئی آواز کے اتار چڑھاؤ کے پیچھے بھاگنا۔ بھاگتے ہی رہنا...... بھاگتے بھاگتے اپنے ہی انگ کو چور چور کر دینا۔ دن اسی طرح گذرتا رہا۔ اور ایک دن اسی طرح روپ وتی چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔

"اب زیادہ دن نہیں جی سکوں گی پدما۔!"

"ایسی اشبھ بات مت کرو دیدی۔"

"کیسے نہ کروں۔؟ انگ انگ چور چور ہو گیا ہے میرا۔"

"تو پھر تم یہ دھندا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں دیدی۔"

"لیکن اکیلے میں اکثر یہ سوچتی ہوں کہ اس دھندے کو چھوڑ کر میں کیا کروں گی۔؟"

"سلائی تو تم سیکھ ہی رہی ہو دیدی۔"

"ہاں وہ تو ہے، لیکن پدما! اگر دھندا بدل کر میں تمہاری طرح جینے کی کوشش کروں تو کیا تمہاری طرح کوئی مجھے بھی اپنائے گا۔؟"

پہلے دھندا بدل کر تو دیکھو دیدی۔ وقت کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت کی صرف ایک انگڑائی انسان کی پوری زندگی کو بدلنے کے لئے کافی ہے۔"

اس دن پدما کی بات پر روپ وتی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ ٹھیک اس بزنس مین کی طرح جو ایک دھندا چھوڑ کر جب دوسرے دھندے کو اپنانا چاہتا ہے تو وہ "ہاں" اور "نہیں" کے بیچ تھوڑی دیر کے لئے پھنس کر رہ جاتا ہے کہ پہلے والا دھندا اس کے لئے بہتر ہے یا دوسرا۔ اگر پہلے والا سود مند ہے اور اس نے اسے ہی بدل دیا تو پھر کیا ہوگا۔؟ کشمکش کے

اس جال میں روپ وتی کے فیصلے کا پنچھی کچھ دیر کے لئے پھڑ پھڑاتا رہا۔ پھر جال توڑ کر آزاد ہو گیا۔

"میں آج سے ہی یہ دھندا بدل رہی ہوں پدما۔!"

"سچ دیدی۔!"

"ہاں پدما۔ میں بھی اب عام عورتوں کی.........."

"دیدی۔!" پدما خوشی کے مارے روپ وتی کے سینے سے لپٹ گئی۔

،،میں لائی تھی تجھے طوائف بنانے، اور تم نے مجھے.............." وہ پدما کی پیشانی کو جذباتی انداز میں چومنے لگی تھی۔

"یہ سب میرا نہیں دیدی! اس بھگوان کا کرم ہے۔"

اس رات دونوں بہت خوش تھیں۔ اس لئے بھی کہ روپ وتی ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے والی تھی۔ آج بار بار اس کے کانوں سے مشین کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔ مشین کی آوازیں ابھرتے ہی وہ خود کو کسی سلائی سینٹر میں پاتی۔ آج اس نے ایسے بھی سلائی کے سلسلے میں بہت کچھ پدما سے پوچھ لیا تھا۔ "تمہارا اسینٹر کتنا بڑا ہے۔؟ کتنی مشینیں ہیں تمہارے یہاں۔؟ وہاں کام کرنے والی عورتیں کیسی ہوتی ہیں۔؟ میں اگر کام شروع کروں تو کتنا کما لوں گی......؟ اور اس کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیکر پدما ہر بار اس معلم کی طرح مسکرا دیتی تھی جو شریر اور کند ذہن بچوں کو راہ راست پر لانے کے کا ہنر رکھتے ہیں۔

دونوں اکثر ہر رات نو بجے کے آس پاس اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے جایا کرتی تھیں۔ لیکن گیارہ بجنے کے بعد بھی آج پدما روپ وتی کے پاس بیٹھی تھی۔

"اچھا دیدی! اب سو بھی جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے۔" پدما پلنگ سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تب اسے شرارت سوجھی۔ "دیدی! کہیں کوئی تمہارا اپنا مل گیا تو پھسل مت جانا۔؟" اس شرارت پر روپ وتی ہولے سے مسکرا کر صرف اسے "پگلی" کہہ کر وہ گئی تھی۔

پدما کے جانے کے بعد روپ وتی نے اپنے جسم کو بستر پہ رکھنے کی جیسے ہی کوشش

کی۔اس کی ناک میں ایک عجیب سی بدبو سما گئی۔وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر وہ یوں ہی کھڑی رہی، اور اپنی آنکھیں شکن آلود چادر پر ڈال دیں۔ ہر سلوٹ میں اسے رینگتا ہوا ایک کالا ناگ دکھائی دیا۔ پھر اس نے شکن آلود چادر کے ایک کونے کو ایک ہاتھ سے پکڑا، زور سے کھینچا اور ایک کونے میں گھما کر پھینک دیا ۔ پھر الماری سے سفید بے شکن چادر نکال کر سلیقے سے اسے پلنگ پر بچھایا۔ کچھ دیر تک وہ بے شکن چادر کی سفیدی کو دیکھتی رہی۔ ہاتھ سے آہستہ آہستہ سہلاتی رہی۔ مسکراتی رہی...... سفید بے شکن چادر پر لیٹتے ہی اسے ایسا لگا جیسے وہ آج زندگی بھر کی ساری تھکن سے عاری ہو گئی ہے۔اس لئے وہ خود کو پھولوں کی طرح ہلکی محسوس کرنے لگی تھی۔ ایک نئی زندگی کی شروعات کرتے ہوئے اسے بڑ لطف آرہا تھا۔ پلکیں بند ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں حسین اور سہانے خواب ایک ایک کر کے اترنے لگے تھے۔

باہر رات کا گھنا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

بارہ کے ٹھیک سامنے گھڑی کے دونوں کانٹے جیسے ہی مل کر ایک ہوئے سیڑھیوں پہ کھٹ کھٹ کی وہی جانی پہچانی آواز ابھری۔ پدما ہمیشہ کی طرح آج بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ دروازے پہ دستک ہوتے ہی دروازے کے قریب چلی آئی ۔ سوراخ سے جب اس نے روپ وتی کے کمرے میں جھانکا تو اسے بے خبر سویا ہوا پایا۔ پھر آنے والے نے کچھ رک کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ روپ وتی سکبگا کر رہ گئی۔ تیسری بار جب آنے والے نے زور زور سے دروازہ پیٹا اور بڑی ہی پیاری آواز میں ”روپ وتی ۔ اری او روپ وتی !“ کہہ کر پکارا تو روپ وتی جاگ اٹھی۔ گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔”اتنی رات کو کون مردود آ گیا ہے نیند خراب کرنے۔؟“اور وہ آہستہ آہستہ دروازہ کی طرف بڑھ گئی۔دروازہ کھلتے ہی وہی سنہری بالوں والا خوبرو نوجوان سامنے نظر آیا۔

اس وقت پدما پر سوچ کی بجلی گر پڑی تھی ”اب کیا ہو گا۔؟“ یہ مرد تو روپ وتی کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ کیا روپ وتی......؟“لیکن اس بار روپ وتی اس کو دیکھتے ہی پہلے کی طرح نہ ہی مسکرائی تھی اور نہ ہی گرمجوشی کے ساتھ اس کا استقبال ہی کیا تھا۔ بلکہ اس کے

آگے بڑھتے ہی وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر پدما حیران ہو گئی۔ اب سنہرے بالوں والا اپنی بانہیں پھیلائے مسکراتے ہوئے روپ وتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مرد اور پدما کے بیچ روپ وتی کھڑی تھی۔ اس لئے ادھر سنہرے بالوں والا روپ وتی کی طرف جیسے جیسے بڑھ رہا تھا۔ ادھر پدما کی آنکھیں ویسے ویسے بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اور سحر میں ڈوبے ہوئے روپ وتی کے وہ الفاظ۔ بہت مزا دیتا ہے وہ مجھے۔ نہ جانے کتنے گر جانتا ہے وہ یہ سب کچھ کے ......" اس وقت اس کے کانوں میں شہد کی مٹھاس گھول رہے تھے۔

"وہیں رک جاؤ۔ آگے مت بڑھنا۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو جاناں۔؟" روپ وتی کی اس حرکت پر وہ حیران و ششدر کھڑا رہا۔ "بتاؤ بات کیا ہے۔؟" پھر اس نے بڑھ کر روپ وتی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ روپ وتی غصّے میں آپے سے باہر ہو گئی۔ زوردار جھٹکا دیکر پہلے اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے اسی ہاتھ سے ایک بھرپور طمانچہ سنہرے بالوں والے کے گالوں پر جڑ دیا اور دانت کچکچاتے ہوئے چلائی۔

"نکل جا حرامی یہاں سے۔"

اس جملہ کی بازگشت ابھی کمرے میں گونج ہی رہی تھی کہ یکایک دھڑام کی ایک زوردار آواز کے ساتھ پدما کا دروازہ کھلا۔ وہ سایہ اور بلاؤز میں تھی۔۔۔ بلاؤز پسینے میں پوری طرح بھیگا ہوا تھا۔

"دیدی۔!" اس نے روپ وتی کو پکڑ کر بری طرح سے جھنجھوڑ دیا۔ پدما کو اس حال میں دیکھ کر روپ وتی بالکل سکتے میں آگئی۔ "تم اسے نہیں بھگا سکتی دیدی......! کتنا سکھ دیتا ہے یہ تجھے.......... کتنا سکھ دیتا ہے یہ مجھے......" اور وہ سنہرے بالوں والے کا ہاتھ پکڑ کر ہیجانی کیفیت میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اسٹرائیکر

"میں شادی نہیں کروں گا۔"

"تو کیا زندگی بھر کنوارہ رہے گا۔ آج میں ہوں کل نہیں رہوں گی۔ تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا۔؟اب مجھ سے گھر کا کام وام بھی نہیں ہوتا۔"

"ماں مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"میں اب کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔ تم دس سال سے اسی طرح ٹالتے رہے ہو۔ اور اب جوانی کی عمر تمہیں چھوڑ رہی ہے۔ شادی کیا بڑھاپے میں کرے گا۔؟ تمہارے لئے آج ہی میں نے ایک اچھی سی لڑکی دیکھی ہے۔ لڑکی والوں کو تم بھی پسند ہو۔ زبان میں نے دے دی ہے۔ اگر اس بار تمہاری کوئی بھی مجبوری سامنے آئی تو میں خودکشی کرلوں گی۔ میں یہ بھول جاؤں گی کہ میرا کوئی بیٹا بھی ہے۔"

ماں زاروقطار روتے روتے سسک پڑی تھی۔

وجے بوڑھی ماں کی سیاہ پتلیوں میں ڈوبتے ابھرتے درد کے بے کراں سمندر کو دیکھ کر کانپ اٹھا۔ جسے انکار کے پتھر نے جنم دیا تھا۔ اور اب درد بڑھ کر اس حد کو چھونے لگا تھا

جہاں انکار کا ایک چھوٹے سے چھوٹا پتھر بھی ماں کے بوڑھے جسم کو چور چور کر کے مٹی میں ملانے کے لئے کافی تھا۔ وجے کا دل دہل اٹھا اور اس کے ہاتھ سے انکار کا پتھر چھوٹ گیا۔

پہلی رات..........!

جب بے شمار الجھنوں کو سمیٹے دروازے پہ دستک دینے آئی تو اس وقت وجے سر سے لے کر پیر تک پسینے میں بری طرح غرق ہو گیا تھا۔ ایک انجانے خوف سے اس کا دل دھونکنی کی طرح دھڑکنے لگا تھا۔ جو اس کی نس نس میں سرایت کر گیا تھا۔ جس سے وہ چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب نہیں کر پایا تب وہ اپنی ہی زندگی سے آہستہ آہستہ دور بھاگنے لگا تھا۔ شاید بھاگنا آج اس کا مقدر تھا۔ اس لئے کہ اسی بھاگ دوڑ میں اس کی عزت تھی۔ اس کا وقار تھا۔ اس کی مردانگی تھی..........

لیکن گھر کی عزت کی خاطر عورتوں نے زبردستی اسے دلہن کے کمرے میں ڈھکیل دیا۔

دونوں آمنے سامنے تھے۔

بیچ میں کیرم بورڈ رکھا ہوا تھا۔ جس پر کالی اجلی اور سرخ گوٹیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

”تمہارا ہاتھ کیوں تھر تھرا رہا ہے۔؟“

”ڈر لگ رہا ہے۔“

”کیوں۔؟“

”کہیں مجھ سے ایک بھی گوٹی نہیں گئی تو......؟“

کھیل کھیل ہے۔ کھیل کوئی بھی ہو، اگر ٹیم کے حوصلے بلند ہیں تو وہ ہارا ہوا میچ بھی جیت جاتی ہے۔ لیکن اگر کھیلنے سے پہلے ہی ٹیم کے حوصلے پست ہو جائیں تو جیت اس سے روٹھ جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ وجے کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ اسٹرائیکر پکڑنے سے پہلے ہی حوصلہ کھو بیٹھا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔؟“

”نہیں، کچھ نہیں۔“!

"نہیں کچھ تو ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"وہ کیا ہے کہ آج میں ذرا تھک............"

"زیادہ تھک گئے ہو۔؟"

"ہاں اس لئے کھیل نہیں سکوں گا۔ رات کافی ہو گئی ہے۔ دیکھو نیند بھی آ رہی ہے۔ صبح جلدی اٹھنا بھی ہے۔" کہتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ اس نے بڑی ہمت کر کے پیشانی پہ اگ آئے پسینے کی بوندوں کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پونچھا تھا۔ اس وقت اس کی اداس آنکھوں میں ایک عجیب ہی منظر تھا۔ جو اسے تھو تھو کر رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی اسے اب نارمل کی سمت لے جا رہی تھی۔ اس کا سر آٹے کی چکی کے پتھر کی طرح گھومنے لگا تھا۔ زمین اس کے سر کے اوپر تھی اور آسمان اس کے پیروں تلے۔ وہ وہاں سے اسطرح اٹھا جیسے اس کے اوپر منوں مٹی کا بوجھ ہو۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک پل بھی اگر اس نے خودکشی کرنے میں دیر کی تو زمین پھٹ پڑے گی اور وہ اس میں سما جائے گا۔ یا پھر عمارت ہی اس کے اوپر گر پڑے گی اور وہ دب کر خاک کا حصہ ہو جائے گا۔

دلہن تھکی ہاری تھی تھوڑی ہی دیر کے بعد وجے نے سمجھ لیا کہ وہ سو گئی ہے۔ اس لئے خودکشی کے مضبوط ارادے کو ذہن کی ڈور سے باندھے وہ چھپتا چھپاتا سامنے والے میدان کے بیچ و بیچ، گہرے اور چوڑے کنویں کے پاس پہنچ گیا۔ رات چاندنی تھی چھلانگ لگانے سے پہلے اس نے نیچے جھانکا۔ پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی چاندنی میں اسے اپنی بوڑھی ماں کا عکس نظر آیا۔ وہ کانپ کر رہ گیا۔ پھر اس کی بھیگی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی چلی گئیں۔

خواب کا در کھلا۔ بوڑھی بھکارن کشکول لئے کھڑی تھی۔

"بیٹا کچھ ملے گا۔؟"

اس نے بوڑھی بھکارن کی طرف آنکھ بند کر کے اپنا چہرہ بڑھا دیا۔ آنسوؤں کے دو موتی سے قطرے کشکول میں گرے۔ بوڑھی بھکارن مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ وجے اپنی اداس آنکھوں میں بوڑھی ماں کی تصویر بسائے، ان کے ارمانوں بھرے راستوں پر

ہولے ہولے کافی دیر تک چلتا رہا۔ پھر گھر پہنچ گیا۔ گھر سے باہر نکلتے یا آتے ہوئے اسے کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ اسلئے دروازہ آہستہ سے کھول کر دبے پاؤں وہ اندر داخل ہو گیا۔

"کہاں گئے تھے۔؟" وہ دلہن کی آواز پر چونک پڑا۔

"کہیں نہیں۔ وہ۔ باہر ذار ضرورت سے۔" کہتے ہوئے اس نے اپنی زبان کی پتھریلی ببول کے پیڑ کو اگا ہوا پایا۔ ،اور اندر ہی اندر درد سے بلبلا اٹھا۔

رات بھر دلہن کی آنکھیں ارمانوں کی سیج پر بے خواب رہیں......

شادی کے بعد ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ خوش گفتار راتوں کی دوڑ کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ سکے۔ لیکن بے چاری شالنی سسرال کی تین راتیں ہی گذار سکی تین رات نہیں۔ بلکہ ایک۔ ایک نہیں بلکہ آدھی اور وہ بھی ادھوری۔ سسکتی اور تاریک رات۔! وقت کی تھکن کا الزام پہلی شب پر گیا تھا۔

لیکن وہ دو راتیں۔!!

شالنی سے وجے وہ راتیں بھی بڑی چالاکی اور مہارت سے چرانے میں کامیاب ہوا تھا۔

دوسری رات آئی تو دوست کی شادی کا خوبصورت بہانہ اسے ہوٹل کے بستر تک لے گیا۔ اور تیسری رات کو اس نے جان بوجھ کر پارٹی کے ہنگامے اور شور و غل کی نذر خود کو کر دیا تھا۔ اس طرح چوتھی رات کے آنے کی باری ہی نہیں آئی اور دلہن کو شادی کی ریت کے مطابق میکے بھیج دیا گیا۔

جاتے وقت وجے نے کہا تھا۔ "آج میں ساتھ جاتا۔ لیکن کمپنی کی ایک ضروری میٹنگ ہے۔ کچھ ہی دیر قبل خبر ملی ہے۔ جانا ضروری ہے۔ ویسے دو چار دن کے اندر ضرور آؤں گا۔"

"نہیں وہ بات نہیں ہے۔ فرصت جلدی اس لئے نہیں مل پائے گی ٹنیٹ، باجا اور دوسری شادی بیاہ کی چیزوں کا حساب کتاب بھی کرنا ہے۔ ماں سے یہ سب کچھ ہونے سے رہا۔ اس لئے میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔ اچھا تم اپنا خیال رکھنا۔ غلطی معاف کرنا۔"

شالنی صبح سے شام تک سورج کے ہمراہ دروازے پہ بیٹھی اس کا سراپا انتظار کرتی۔ ساری رات کروٹ کروٹ بدل کر ایک آس میں بے چاری گذار دیتی۔ لیکن وجے نہ آتا۔

شالنی وسہر اسمیٹ کر جب میکے سے سسرال آئی تو یہ جان کر حیران ہو اٹھی کہ وجے اسے چھوڑ کر دوسرا شہر جا چکا ہے۔

وجے جہاں گیا تھا: وہاں بھی اس کی کمپنی کی ایک برانچ تھی۔ دو سال قبل کمپنی کی طرف سے اسے وہاں بھیجا رہا تھا۔ لیکن اس کا دل تو اس شہر کی رونقوں میں گم تھا۔ رونق اس کی ماں تھی۔ ماں کہ جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ اور یہاں ماں کے اوپر ملنے جلنے والے تھے۔ اس لئے یونین کے لیڈروں سے مل کر اپنا تبادلہ ملتوی کروا دیا تھا۔

اس شہر میں رہنے کے لئے اس نے خود کو بہت ہی آسانی کے ساتھ راضی کر لیا تھا۔ گھٹ گھٹ کر جینے سے بہتر ہے انسان مر جائے۔

لیکن آج کچھ لے دے کر وجے اس گھٹن آلود ماحول میں بھی مسرت کی خوشبو سمیٹتا رہا۔ یوں تو ماں کی جدائی کسی کے لئے بھی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بھی تھی۔ اس لئے پہلے ہفتے کی تمام راتوں کو اس نے جاگتی آنکھوں پر گذرنے دیا تھا۔ دل پر سیاہ چٹان رکھ کر وہ پہلے اجنبی شہر میں رہنے کے لئے خود کو منایا، مجبور کیا اور آخر میں تیار کر لیا۔ اس سے پہلے کبھی اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ماں کو اس طرح تنہا چھوڑ کر اجنبی شہر میں رہنے اور بسنے کے بارے میں سوچ بھی سکے گا۔

لیکن وقت کا کیا ہے۔؟ وہ جب، جس سے جو چاہتا ہے کر والیتا ہے۔ وہ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ لیکن آنے اور جانے کے درمیان چھوڑ جاتا ہے، وجے جیسے کمزور انسان کو بے بس اور مجبور کر کے۔ کمزور اور بے بس انسان وقت کی انگلی پر ناچتا ہے۔ اس لئے نئے شہر میں اسے کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ لیکن ماں کا دل تو ماں دل ہوتا ہے۔ اکثر وجے کو پریشان کر جایا کرتا۔ اور جب بھی وہ پریشان ہوتا۔ خط کے راستے سے لفظ لفظ چل کر ماں سے مل لیتا۔

پہلے وجے ہفتے میں خط بھیجا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ وقفہ بڑھتا رہا اور بڑھتے بڑھتے مہینے سے جا ملا۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اسے تنخواہ ملتی۔ وہ ماں اور بیوی کے ماہانہ اخراجات

کے علاوہ دوسری ضروری چیزوں کے پیسے بھی ڈاک سے ہی بھیج دیا کرتا۔ کبھی خطوط ماں کے نام ہوتے تھے۔ ہر خط میں وہ اپنا دل نکا کر رکھ دیتا تھا۔ جسے صرف ایک بوڑھی آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی۔ خط میں بیوی کے لئے بھی بھرتی کے چند ایک جملے ہوتے۔ دونوں خط پڑھکر خوش ہو جایا کرتیں۔ جواب میں بیوی خط لکھا کرتی۔ ہر خط میں آنے کی بات لکھتی۔ کبھی جھوٹی باتیں بھی لکھ جاتی۔ "ماں کی طبیعت خراب ہے۔ ان کی آنکھوں کی روشنی کم ہونے لگی ہے۔" کبھی اپنے دل کا رونا سناتی۔ مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی ہے۔ کل آپ خواب میں آئے تھے۔ اور وہ پہلی رات کا......! آپ سچ مچ بڑے بے وفا ہیں۔ یہاں میرے دل پر کیا گذرتی ہے۔ آپ کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ پتہ نہیں اجنبی شہر میں اجنبی لوگوں کے درمیان آپ کا دل کیسے بہل رہا ہے۔؟ آپ نے گزشتہ خط میں لکھا تھی کہ اگلے ماہ کی دوسری تاریخ کو آرہا ہوں۔ کیوں نہیں آئے؟ کہیں وہاں کوئی..................؟"

شالنی کے خطوط شکایتیں لئے وجے کے روبرو ہوتے۔ وجے ان شکایتوں کو بڑی صفائی سے صاف کر دیا کرتا۔ معمولی گھرانے کی کم پڑھی لکھی، گائے جیسی سیدھی سادھی بیوی کی خوبصورت باتوں کے جال میں وجے پھنس کر رہ جاتا۔ ہر بار شالنی کی شکایت بھری باتوں کو وجے کچھ اس طرح سے اپنے دوسرے خط کے ذریعہ رفو کرتا جیسے کوئی رفوگر پھٹے ہوئے کپڑے کے ساتھ مہارت اور صفائی دکھاتا ہے۔ اس ماہ ضروری کام میں پھنس گیا تھا۔ اس لئے نہیں آسکا۔ اگلے ماہ کی دوسری تاریخ کو آرہا ہوں۔ آتے ہی ساری شکایتیں دور کر دوں گا سمجھی۔!"

اور ایسی ہی باتوں پر گائے جیسی سیدھی سادھی بیوی یہ سمجھتی کہ اس بار اس کا شوہر آہی رہا ہے۔ اگلے مہینے کی دوسر تاریخ کو شالنی صبح سے شام تک آئینے کے پاس بیٹھی سنگھار پٹار کرتی۔ آئینے کے ساتھ بات کرنے میں گھنٹوں مصروف رہتی۔ ہنستی، مسکراتی اور اپنے حسن کے نکھار کو دیکھ کر مچل مچل جاتی۔ اس دن گھر کے سارے سامان کو قرینے سے سجاتی۔ زیادہ وقت پلنگ کے اردگرد سجانے میں گذار دیتی۔ پلنگ کی سفید چادر کو وہ بار بار اٹھاتی جھاڑتی پھر بے شکن اسے بستر پر ڈال دیتی۔ تکیے کو بار بار دیکھتی۔ کبھی ایک کو اٹھا کر ادھر

رکھتی تو کبھی دوسرے اٹھا کر ادھر۔ اور کبھی ایک کے اوپر ایک رکھ کر دونوں کی اونچائی کو ناپنے میں اتنا محو ہو جاتی کہ کہ گھنٹوں اس میں بیت جاتے۔ پھر اپنے آپ میں مسکراتی دونوں کو الگ کر کے خود باتھ روم میں چلی جاتی اور گھنٹوں جھرنے کے ٹھنڈے پانی کے نیچے بیٹھی رہتی۔

دوسری تاریخ کا نمبر بدلنے تک شالنی اپنی انتظار بھری آنکھیں دروازے پر رکھتی۔ ہر آہٹ پر چونکتی۔ ہر آنے جانے والے پر ایک نظر ڈالتی۔ لیکن وجے نہ آتا۔ شالنی انتظار کے کرب میں ڈوب جاتی۔ ماں بھی اداس ہو جاتی۔ جب شالنی ماں کو اداس پاتی تو چہرے پہ مسکراہٹ کا غازہ مل کر تسلی کے دو بول سے ماں کے ممتا بھرے دل کو خوش کرتی اور انہیں امید کی سنہری ڈور سے باندھ دیتی۔

"ان کو وہاں بہت سارا کام دیکھنا پڑتا ہے۔ اس بار بھی کوئی ضروری کام آڑے آگیا ہو گا۔ یا پھر چھٹی نہیں ملی ہو گی۔ دور بھی تو کوسوں کا ہے۔ اگلے ماہ کی دوسری تاریخ کو وہ ضرور آئیں گے۔ میرا دل کہہ رہا ہے۔ ماں۔"

قریب سال بھر آسمانی افق پر سورج ہر روز ڈوبتا ابھرتا رہا۔ لیکن وہ نہ ہی نکلا اور نہ ہے ڈوبا......

ہر موسم لوٹ کر آتا ہے۔ لیکن یہاں فرقہ پرستی کا سرخ موسم جو بادل بن کر ہمارے سروں پر چھایا رہتا ہے، کبھی نہیں چھٹتا...... کہ آج یہی ہماری وراثت کا انمول رتن ہے اور جس کی پاسداری ہی ہمارا سب سے بڑا دھرم ہے۔ دھرم کا اولین مقصد ہے۔

وجے کا شہر بھی اسی مقصد کے حصار میں قید تھا۔ اس لئے یہاں کے لوگ آتش گیر ہواؤں کے اسیر ہو گئے تھے۔ پولس بھی نوکری کے ڈر سے فرض شناسی پر اتر آئی تھی۔ جرائم پیشہ افراد گرفتار ہو رہے تھے اور جیل کی دیواریں آہستہ آہستہ موٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ مقصد حکومت کا بالکل صاف تھا کہ اگر زیادہ دنوں تک سرکار کو بنائے رکھنا ہے تو ایسے لوگوں سے جلوس کو پاک رکھا جائے۔ تبھی شہر کے آسمان میں امن کا سفید جھنڈا لہرایا جائے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے کہ مقررتاریخ سے ایک دن قبل آتشی جلوس کی

نمائندگی کرنے والے نیتا گن یہاں آئے اور اپنے اپنے ننگے بچوں کے تن چھپانے کے لئے رات کی آدھی سیڑھی پر چڑھ کر، امن وامان کے لہراتے ہوئے سفید جھنڈے چرالے گئے۔

پھر ہونا کیا تھا۔

لاکھوں کا جلوس تھانے کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ سامنے دوسرے مذہب کی عبادت گاہ تھی۔ ہزاروں لوگ وہاں جمع تھے۔ یکا یک ہزاروں اور لاکھوں کے مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ لاکھوں کے ہاتھوں میں طرح طرح کے ہتھیار تھے اور ہزاروں کے چہرے پہ بنتے بگڑتے سوالات...... پھر ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔

لاکھوں نے مل کر تھانے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کرنے لگے جو شریف النفس اور تہذیب کا سر چشمہ تھے۔ ان میں کچھ ایسے ایسے بھی شریف تھے۔ جن کے نام گلی کوچوں میں بکتے تھے۔ عورتیں انہیں دیکھ کر اپنا چہرہ چھپا لیتی تھیں کہ بے چاروں کو کہیں شرم نہ آجائے۔

جب ان شریفوں کو چھوڑنے سے پولس صاف انکار کر گئی تو ماحول میں ایک عجیب سی وحشت طاری ہوگئی۔ جس کے حصار میں تھوڑی ہی دیر کے بعد سارا شہر چلا آیا۔

رات ہوئی اور سارا شہر آگ کے دہکتے ہوئے گولے میں بدل گیا۔ ہر سمت تیر، گولی، بم، آگ، دھواں، چیخ، لوٹ مار اور زنا بالجبر کا بازار گرم ہو گیا......

وجے کا گھر ایک غیر محفوظ علاقے میں تھا۔ جہاں ایسے حالات میں خود کو بچانا ایسا ہی تھا جیسے شیر کی گپھا میں خالی ہاتھ جا کر زندہ لوٹ آنا۔ اس لئے جب شہر کی حالت نازک سے نازک تر ہوتی گئی۔ اور پھر کہیں کہیں سے گولی اور بم کی ملی جلی آوازیں بھی آنے لگیں تب ایسے وقت میں وجے اپنے غیر محفوظ گھر کو چھوڑ کر پچھواڑے والے میدان کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ میدان کے بیچوں بیچ گھنی جھاڑیوں تک اس نے خود کو چھپتے چھپاتے بڑی مشکل سے پہنچایا اور اس جگہ کو محفوظ جان کر وقتی طور پر اسے اپنی پناہ گاہ بنا لیا۔ یہاں پہنچ کر اسے ایسا لگا تھا کہ جیسے دنیا کے نقشے میں سب سے محفوظ جگہ یہی وہ جھاڑی ہے جہاں چھپ کر ہر کوئی اپنی جان بچا سکتا ہے۔ اس لئے یہاں اسے کچھ سکون سا ملا تھا۔ لیکن جب جب ہوا تیز چلتی تب

تب سوکھی پتیوں میں پھڑپھڑاہٹ پیدا ہوتی اور ایسے وقت میں وہ کانپ جاتا۔ چونک کر اپنی گردن سیدھی کرتا۔ اپنی سانس روک لیتا۔ کبھی کبھی اندھیرے میں نظر ادھر ادھر دوڑاتا۔ کبھی بھاگنے کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ اور کبھی......

اس طرح خوف و ہراس کے درمیان اس نے رات کا آدھا پہر گذار دیا۔ گولی اور بم کی آوازیں اس کی روح کو چھید رہی تھیں۔ آگ کی لپٹوں کو جب بھی وہ آسمان میں بلند ہوتے ہوئے دیکھتا تو اسے ایسا لگتا کہ جیسے آج کی رات انسانیت اسی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گی۔

انسانیت کی لاش ایک ایک کر کے جلتی رہی۔ وہ کبھی اپنی آنکھیں بند کرتا اور کبھی کان کے اوپر اپنے دونوں ہاتھ رکھ لیتا۔

پھر یکایک کچھ ایسا ہوا کہ اس کے کان خود بخود کھڑے ہو گئے۔ کسی کے قدم بڑی بے رحمی کے ساتھ پتیوں کو اپنے بوٹوں سے روندتے ہوئے جھاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر جھاڑیوں کو چیرتے ہوئے قدموں کی چاپ اس کی طرف بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ پھر بوٹوں کی آواز سے اسے سمجھتے دیر نہیں لگی تھی کہ ایک نہیں بلکہ وہ دو ہیں۔ ڈر کے مارے اس کے جسم کا سارا خون اس کی نس کی نلی میں سرد ہو کر جمنے لگا تھا۔ سانس اس کی رکی کی رکی رہ گئی تھی۔ وہ فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ لیکن ایسے میں کہاں جائے؟ بھاگ کر بھی وہ انہی لوگوں کے بیچ گھر جائے گا اور مارا جائے گا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بوٹوں کی آواز اس کے بالکل قریب آکر رک گئی۔ لیکن رات کی تاریکی اور جھاڑیوں نے مل کر اسے جیسے کچھ دور کر دیا تھا۔ اس لئے بہت پاس میں آکر بھی بوٹ والے وجے سے بے خبر رہے۔ اس وقت موت کو اپنے سے اتنے قریب پا کر وہ بری طرح سے گھبرا گیا تھا۔ ڈر کے مارے سر کو گھٹنوں پہ رکھ کر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنوں کو مضبوطی سے جکڑ کر اپنی سانسوں کو اپنے سینے میں اس طرح روکے رکھا جیسے وہ بھی جھاڑی کا ہی ایک حصہ ہو۔ اس طرح جھاڑی سے الجھتی ہوئی سرگوشیاں اس سے ٹکرانے لگیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ یہیں لٹا دیا جائے۔؟"

"ہاں۔!"

"لیکن چلو۔ دیر مت کرو۔ ورنہ......"

وجے گھٹنے میں سر دیئے بہت دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ پہلے لڑکی یا تو بیہوش تھی یا پھر زور سے کسی ایک نے اس کا منہ دبا رکھا تھا۔ لیکن اسی وقت بھی اس کی دبی دبی سی سسکی اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ سسکی گھنٹہ بھر کے بعد ہچکی میں بدل گئی۔ پھر یکایک خاموش ہو گئی۔

اب وجے کا سر گھٹنے میں نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کپکپا رہا تھا۔ بلکہ اس وقت اس کے جسم کے ایک خاص حصے میں عجیب سی سنسناہٹ پیدا ہو گئی تھی اور......

رات کے اندھیرے میں جھاڑیوں سے الجھتی ہوئی سرگوشیاں اسے ایک بار پھر سنائی دیں۔

"بے چاری۔!"

"تمہارا کام تو ادھورا نہیں رہا۔"

"نہیں۔"

"چلو اچھا ہوا۔ جاتے جاتے ہم دونوں کو سورگ کا مزہ چکھا گئی۔"

دونوں شیطانی قہقہہ لگاتے، جھاڑیوں کو چیرتے باہر نکلے اور تیز تیز قدموں کے ساتھ رات کے اندھیرے میں بستی کی طرف لوٹ گئے۔

وہی سرگوشیاں اور وہی سنسناہٹیں آہستہ آہستہ طوفان کا شور بن کر اس کے اندر اترتی رہیں۔ اب اس کے اندر نہ ہی کوئی ڈر تھا اور نہ خوف۔ بلکہ ایک نئی تازگی تھی۔ جس نے اسے دوبارہ زندگی کی نئی زمین پر کھڑا کر دیا تھا۔ اندھیرے کو چیرنے کے لئے اس نے پہلے اپنی جیب سے لائٹر نکالا۔ آن کیا اور پھر مدھم روشنی کے ہاتھوں سے جھاڑیوں کو چیرتا ہوا وہ اس طرف بڑھ گیا، جہاں سے کچھ دیر قبل......

وہاں پہنچتے ہی اس کے قدم رک گئے۔۔ ہلکی روشنی میں بھی اس نے ٹھیک سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک جوان لڑکی کی لاش تھی۔ لیکن جب کچھ رک کر اس نے لاش کے چہرے پر

لائٹر کی آنکھ کو رکھا تب ایک بار پھر اس کے جسم میں ہلچل برپا ہو گئی تھی۔ سنسناہٹ تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اور وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ لڑکی کے خوبصورت چہرے پہ جہاں دانتوں گہرے نشان تھے، وہیں جسم کے دوسرے حصے ناخنوں کی تیز دھار سے کراہ رہے تھے۔ اور جگہ جگہ سے ڈھلکا ہوا لہو رنگ درد کی کہانی سنا رہا تھا۔ لمبے لمبے بال گرد آلود اور بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ کپڑے کے چیتھڑے جھاڑیوں میں اٹکے ہوئے تھے اور کچھ لاش کی بغل میں بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد وجے کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں برہنہ جسم کے نشیب و فراز پر ناچنے لگیں۔ ناچتے ناچتے اس کی تیسری ٹانگ دائرے سے جیسے ہی الجھی، وہ دھڑام سے گر پڑا۔ اور وہ شیطان جو ہمیشہ سے موقع کی تاک میں تھا اس کی پشت پر پوری طاقت سے سوار ہو گیا۔

"یہ شالنی جیسی جیتی جاگتی عورت تو نہیں ہے جو سرد اور گرم کے فرق کو لفظوں کا پیراہن دے سکے گی۔"

پھر جب کھیل شروع ہوا تو وجے نے اسٹرائیکر سے گوٹی پر ہٹ لگائی۔

اور اس بار وجے نے یہ بورڈ جیت لیا۔

☆☆☆

کتّے والی

"کتے والی۔"

ارے کتے والی......"

یہ آوازیں کبھی کسی نکڑ سے کبھی کسی گلی سے، کبھی کسی بر آمدے سے، کبھی کسی گھر کے اندر سے، کبھی بچوں کی توتلی زبانوں سے، کبھی بوڑھوں کے غول سے، کبھی جوانوں کے درمیان سے، اور کبھی ...... کبھی یہاں سے اور کبھی وہاں سے ابھر کر قطرہ قطرہ جب اس کے وجود میں اترتیں تو وہ بھر پور آسودگی سے ہم کنار ہو جاتی .... اور اسے چالیس سال کی عمر میں بھی ایسا لگتا جیسے دنیا کا سب سے خوبصورت نام یہی ہے۔

سنیتا پہلے ان پھبتیوں سے بھاگنا چاہتی تھی۔ لیکن بھاگ نہیں پائی کہ حقیقت سے منہ موڑنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اور اس نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ "سنیتا" سے "کتے والی" بن جائے گی۔ اور یہی نام اس کی شناخت کا ذریعہ بنے گا۔ شروع شروع میں اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ لوگ اسے "سنیتا" کہہ کر پکاریں۔ لیکن آہستہ آہستہ

"کتے والی" اس کے کانوں کو ایسا بھا گیا کہ اسے اپنا نام "سنیتا" ہی انجانا سا لگنے لگا۔ اور کبھی اس نام میں وہ اس طرح کھو جاتی کہ گھر والے اسے "سنیتا"، "سنیتا" پکار رہے ہوتے اور وہ نہ "ہوں" کر رہی ہوتی اور نہ ہی "ہاں"۔ کہ وہ تو کتے والی ہے۔

"کتے والی کو لے کر پہلے کئی بار لوگوں سے سنیتا کی تو تو میں میں ہوئی۔ کئی کے بٹن ٹوٹے۔ ایک دو کے گال بھی اس چکر میں سرخ ہوئے۔ لیکن وہ ایسے موڑ سے گذرتے وقت جہاں ان بھپتیوں کا سامنا ہوتا، چیخ چیخ کر یہ بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھتی کہ لفظ "کتا" کے پیچھے چھپے ہوئے معنی کی کون سی دنیا آباد ہے۔ لیکن آگے بڑھتے ہی وہ خود سے الجھ جاتی کہ اس نے کتے کو اتنا چاہا ہے تو اس میں لوگوں کا کیا قصور۔! وہ تو ایسی چاہت کا کوئی نہ کوئی نام دیں گے ہی۔

کشمکش کی اس گھنی چھاؤں میں خود کو پانا اور پا کر کھو دینا۔ کھو کر پالینا اور یہ سلسلہ...... سلسلہ در سلسلہ چلتا رہنا۔ کتنا عجیب ہے۔!

"مرد کے بغیر عورت کا وجود نامکمل ہے۔"

فلم "عورت" دیکھتے وقت من پسند اداکارہ کی زبان سے یہ جملہ سن کر وہ کانچ کی طرح چیخ چیخ کر اپنی ہی کرچیوں سے خود کو لہو لہان کر گئی۔ اس دن اس اداکارہ کے نام سے ہی کراہیت سی ٹپکنے لگی تھی۔ اس لئے اس نے اس کی خوبصورت تصویر کو جسے اپنے ڈرائنگ روم کی دیوار پہ نمایاں جگہ چسپاں کیا تھا، کالک پوت کر کھڑکی سے جب تک باہر نہیں پھینکا تب تک اسے چین نصیب نہیں ہوا۔ اس کے باوجود وہ دن بھر روتی رہی تھی۔ حالانکہ وہ بھی دنیا کی ہر عورت کی طرح یہ جانتی تھی کہ مرد کے وجود کے بغیر...... لیکن اس کے بعد بھی وہ مردوں کی پرچھائیں سے خود کو پاک رکھنا چاہتی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے روم میں ہی رہا کرتی تھی۔ باہر آتے جاتے وقت اسے جب بھی یہ محسوس ہوتا کہ کسی مرد کی آنکھیں اس کے وجود پر آکر ٹھہر گئی ہیں تب اس کے جسم کے ایک ایک حصے میں سختی آجاتی۔ اور آنکھیں لہو میں ڈوب جایا کرتیں۔!

سنیتا بچپن سے ہی پڑھنے میں کمزور تھی۔ میٹرک کم نمبروں سے پاس کرنے کے

بعد بھی انگریزی سیکھنے کی اسے دھن تھی۔ لیکن اس کے باوجود ائی۔اے کی دو سالہ زندگی میں اس نے کبھی انگریزی کا کلاس نہیں کیا ۔ صرف اس لئے کہ انگریزی کا کلاس لینے والا بھی ایک مرد تھا۔ وہ اپنے ٹیچر کو بھی عام مردوں کی صف میں رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے باپ کو بھی اس صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اور پھر ایک دن جب اس نے انہیں ماں کے ساتھ ویسی ہی عجیب حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا تو اس دن اس کی آنکھیں دیوار پہ ٹنگی ہوئی بندوق کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ گھر میں شادی بیاہ کی باتیں جب بھی اچھالی جاتیں، اس کا دل چاہتا کہ ماتا پتا کا منہ نوچ لے اور چلا کر چلا کر پوچھے اگر شادی ہی محبت اور محبت ہی شادی، تو میری دو بہنیں۔.....!"

سنیتا نے اس کتے کو اپنے یہاں اس وقت سے پال رکھا ہے، جب پلّے کی آنکھیں نرم و نازک جھلی میں پوشیدہ تھیں۔ دس سال قبل جب اپنی کھلی آنکھوں سے اس نے پہلی بار دنیا دیکھی تو خود کو سنیتا کی گود میں پاکر بڑا فرحت بخش احساس ہوا تھا۔ پلّے نے جب اپنے ننھے منھے پیروں سے دھرتی کی سطح پر بڑھنا شروع کیا تو سنیتا کے معصوم چہرے پہ مسکراہٹ کی لکیریں ڈوبنے اور ابھرنے لگی تھیں۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ دونوں ایک دوسرے میں اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے ....

سنیتا نے پلے کا نام سورج رکھا تھا۔ سورج کی روشنی سے وہ اپنی تاریک زندگی کو روشن کرنا چاہتی تھی۔ شاید آسمان میں چمکتے ہوئے سورج کی روشنی اس کی تاریک زندگی کو جگمگانے کے لئے کافی نہ تھی۔ اس لئے اس نے اس سورج کا سہارا لیا تھا۔ کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ ساری دنیا کا سورج ایک ہے۔ تاہم اندھیری راہوں میں بھٹکنے والے مسافر اپنی راہ کو روشن کرنے کے لئے موجودات کی دنیا سے پرے اپنی تخیلاتی کائنات میں روشنی کی ایک دنیا آباد کرتے لیتے ہیں،۔ اور یہ روشنی انہیں ملتی ہے محبت کی گرمی سے جوان کی قربت میں سانس لینے والا انہیں عطا کرتا ہے۔ اس طرح سورج اس کا ہم نوا بن بیٹھا تھا۔

سورج نے وقت کے ساتھ اپنا قد اونچا کیا تو سنیتا اسے پارک لے جانے

لگی۔ رنگین فواروں کے قریب پختہ بنچ اور کبھی ہرے ہرے مخملی فرش پہ دونوں بیٹھے نظر آتے۔ دور دیہ اشوک کے پیڑ سے گل مہر تک۔ اور گلاب کے باغ سے تالاب کے کنارے کنارے دوڑتے ہوئے دونوں بہت دور نکل جاتے۔ گیند پھینکنے لانے اور چھونے کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ رات کی سیاہی اپنے پنکھ پھیلا کر خوف کا احساس نہ دلانے لگتی۔

کار ڈرائیو کرتے وقت بھی سورج، سنیتا کے ہمراہ اگلی سیٹ پر ہوتا۔ شاپنگ میں بھی دونوں ساتھ رہتے ۔ جہاں جہاں سنیتا جاتی، وہاں وہاں سورج کا جانا اتنا ہی ضروری ہو جاتا، جتنا کہ سورج کے نکلتے ہی روشنی کا پھیل جانا...... غسل بھی دونوں ساتھ کرتے۔ سنیتا جس ٹاویل سے اپنے ملائم اور بھیگے ہوئے جسم کو صاف کرتی، اسی ٹاویل سے سورج کے نرم و روئیں دار جسم کو اپنی انگلیوں سے آہستہ آہستہ ایک اہتمام کے ساتھ کچھ اس طرح سے پوچھتی جیسے اسے ڈر ہو کہ یہ مخملی غلاف ادھڑ نہ جائے۔ جب کبھی سوج بیمار پڑ جاتا تو سنیتا اداس اور پریشان رہتی۔ نہ کسی سے گھل مل کر بات چیت کرتی۔ نہ ہی کسی کام میں حصہ لیتی۔ بس! اداس عالم میں سورج کے پاس بیٹھی اس کے مخملی جسم کو دھیرے دھیرے سہلاتی رہتی۔ فون پہ ڈاکٹروں سے رائے مشورہ لیتی۔ قیمتی دواؤں کا ڈھیر لگا دیتی۔ اس خوف سے کہ کہیں سورج کو کچھ ہو گیا تو وہ اس تاریک دنیا میں بھٹکتی رہ جائے گی۔ پر کوئی سچائی اور محبت کی روشنی اس کے وجود کو نہیں چھو سکے گی۔ پر خلوص، بے داغ اور بے لوث پیار پھر اس کی دنیا میں لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اور بس۔ اس کی ایسی ہی فضول حرکتوں سے گھر والے پریشان ہو جاتے۔ اسے ڈانٹ پڑتی لیکن سنیتا پر اس کا کوئی اثر نہ پڑتا۔

سنیتا جسم تھی تو سورج اس جسم میں زندگی کی لہر دینے والی آتما۔ یوں تو سورج کو پانے کے بعد سنیتا کو دنیا کی رنگینیوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ لیکن ایک بار ایک عزیز کی ضد پر پارٹی میں شرکت کی حامی بھر لی۔ اور جب وہ پارٹی میں سورج کے ہمراہ پہنچی تو چوکیدار نے اسے ہال سے باہر رکھنے کی تاکید کی۔ سنیتا اس کی غیر اخلاقی حرکت سے بھنا گئی۔ اس کے بعد پھر اس نے کسی پارٹی میں شرکت نہیں کی۔۔

سنیتا تم جتنا پیار ایک کتے کو دیتی ہو، اگر اتنی ہی شدت سے کسی کو اور چاہو تو تمہارا مستقبل سنور جائے گا۔ تم ہی تو بتاؤ بھلا، کتے کو پوجنے سے تمہیں کیا ملتا ہے۔۔؟ ارے کتے کتے ہوا کرتے ہیں، انسان نہیں ایک سہیلی نے اسے طنز کا نشانہ بنایا۔

ٹھیک کہہ رہی ہے کتے کتے ہوا کرتے ہیں، انسان نہیں......اور یہ بات بھی بہت اچھی ہے۔ ورنہ آج کا انسان تو گلی کوچوں میں، گندی چیزوں کی تلاش میں بھٹکنے والے آوارہ کتا بن چکا ہے۔ چلو کتے نے اپنی شناخت تو کھوئی۔ اور نہ ہی آج کے انسانوں کی طرح وہ بے وفا ہی ہے۔......"اس کے اس فلسفیانہ خیال کو قہقہوں کے طوفان میں اڑا دیا گیا تھا۔

سنیتا کا جنم ایک خوشحال گھرانے میں ہوا تھا۔ گھر سے کچھ ہی دور پر اس کے والد کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ جہاں تیس کے آس پاس مزدور کام کیا کرتے تھے۔ باپ کی موت کے بعد اس نے تمام مردوں کی جگہ عورتوں کو بحال کر لیا تھا۔ حالانکہ اس سے اس کی فیکٹری کو کافی نقصان ہوا۔ لیکن سنیتا کو اس کا ذرا بھی افسوس نہیں ہوا۔ پھر کچھ ہی دن بعد ماں بھی اس دنیا سے کوچ کر گئی تھی۔ اب وہ گھر پہ اکیلی ہی رہ گئی تھی۔ کبھی یہ تین بہنیں تھیں۔

ایک کا نام مینکا تھا اور دوسری کا رنجیتا۔ عمر اٹھارہ انیس کے قریب رہی ہوگی۔

سنیتا اس وقت بارہ برس کی معصوم بچی تھی۔ لیکن اس عمر سے جڑی ہوئی یادیں ایسی تھیں۔ جس نے اسے بارہ برس کی عمر میں سنجیدہ اور عمر رسیدہ بنا دیا تھا۔ یادیں جس نے اسے تیرگی کے اتھاہ سمندر میں دھکیل دیا تھا اور نفرت کی ایک دنیا اس کے دل میں آباد ہو گئی تھی۔ نفرت کی دنیا تو ہمیشہ تاریک ہی ہوا کرتی ہے اور اس تاریکی میں صرف وہی روشنی بچی روشنی اپنے وجود کو منوا سکتی ہے جو حقیقی محبت کے بطن سے پیدا ہوئی ہو۔

دونوں بہنیں سنیتا کو بے حد چاہتی تھیں۔ ماں نے تو صرف جنم دے کر ایک عورت کا ازلی فرض ادا کیا تھا، لیکن اس کے بعد ایک ناپختہ زندگی کو مستحکم زمین پر کھڑا کرنے کا بار اس کی دونوں بہنوں نے سنبھال لیا تھا۔

"بھوں......بھوں......بھوں......"

گم صم اور تصورات کی دنیا میں سنیتا کو بھٹکتے ہوئے دیکھ کر سورج زوروں سے

بھونکنے لگا۔

"کیوں چلا رہا ہے پگلے۔؟" سنیتا نے ماضی سے پلٹتے ہوئے سورج کو اپنی گود میں بھر لیا اور تھپتھپاتے ہوئے بولی...... میں تمہیں چھوڑ کر کہیں تھوڑے ہی گئی تھی۔

کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے۔ یکایک سنیتا کی نظر سامنے کی دیوار سے جا لگی۔ اس کی بڑی بہن اس کے سامنے کھڑی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے کل ہی کل چھاتا چلا گیا۔ وہ کل جس کے تصور سے اس کے بدن کا رواں رواں کانپ اٹھتا تھا۔

گلاب چہرہ، کنول آنکھیں، سیاہ زلفیں اور اس پر سڈول گداز بدن...... واقعی امیکا کافی خوبصورت تھی۔

رات کی تنہائیوں میں اس کے وجود پر انگڑائیوں کا موسم چھایا کرتا تھا۔ اس کے اندر ابھرتے ہوئے پر شعلہ جذبوں کی کوئی تھاہ ہی نہیں تھی۔ خوابوں کی دنیا میں چہروں کی ایک بھیڑ ہوتی، جہاں قہقہوں اور موسیقیوں کا طوفان ہوتا اور وہ نشہ کی کیفیت میں سرشاری کا مزہ لیتی...... تب اس کے قدم ڈگمگاتے۔ اور وہ ایک ایسے وقت میں جب انسان ڈوبنے والا ہو سنبھلنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر......!

رات کی تاریکیاں اور دن کے اجالے...... قہقہے اور موسیقی کی دنیا اس کے گداز بدن سے رس کی بوندیں پیتی رہیں، اور وہ دھیرے دھیرے اپنے وجود کے احاطے میں ایک چاندنی کو طلوع ہوتا ہوا دیکھنے لگی...... لیکن وہ سورج جو چاند کو روشن کرتا ہے، اپنی روشنی دینے سے انکار کرتا رہا، اور پھر ایک دن وہ اپنی پیشانی پہ ابھرے ہوئے دھبےّ کو آئینے میں دیکھ کر بے چین ہو گئی۔ اور اب بے چینی کافی بڑھ گئی تب وہ بے نور چاند کو اپنی کوکھ میں چھپائے سمندر کی عمیق گہرائیوں میں اتر گئی۔ سنیتا کی آنکھوں نے جب سب کچھ دیکھا تو اس کے ذہن نے یادوں کی شکل میں ان باتوں کو محفوظ کر لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل کا ایک گوشہ ذرا سخت ہو گیا۔ جیسے پگھلے ہوئے لوہے پر سختی کی ہلکی سی پرت جم گئی ہو۔

ایک طرف سنیتا گہری سوچ میں گم تھی تو دوسری طرف سورج یہ سوچ رہا تھا کہ سنیتا اس سے ناراض تو نہیں ہے۔ اسی شش و پنج میں وہ کچھ دیر تک پھنسا رہا۔ آخر جب اس

سے رہا نہیں گیا تب اس نے بڑھ کر سنیتا کے پلو کو کھینچنا شروع کر دیا۔ سنیتا نے چونک کر اپنی گردن سیدھی کی اور اپنے آنچل کو سورج کے منہ میں دبا ہوا دیکھ کر سوچنے لگی۔

"کیا سورج بھی انسان ہو گیا ہے۔؟"

مگر دوسرے ہی لمحہ اسے خیال آیا کہ سورج کو انسان کہنا، سورج کی توہین ہے۔ اس لئے سنیتا نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑے پیار سے دیکھا۔ دیکھتے ہی سورج نے آنچل چھوڑ دیا۔ اور آنچل کے چھوڑتے ہی سنیتا نے بڑھ کر اس کے منہ کو چوم لیا۔

ماضی ایک بار پھر بوند بوند یاد بن کر حال کی دھرتی پر ٹپکنے لگا......

دوسری بہن رنجیتا بہت خوبصورت تو نہیں تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کا حسن تھا۔ جیسے سرے میں شراب ڈال کر وہ صندل کی چھڑی سے اپنی آنکھ میں لگاتی رہی ہو۔ اس لئے جب کبھی ان آنکھوں میں کسی پر وقار مرد کی آنکھیں سماتیں، وہ اس طرح پھیل جاتی جیسے سورج کے نکلتے ہی رات کی تاریکی ساری کائنات پر محیط ہو جاتی ہے۔

اور ایک دن شخصیت سے بھرپور ایک مرد اس کی زندگی میں ایسا آیا کہ رنجیتا سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، ہنستے بولتے، اور کھاتے پیتے صرف اسی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اس طرح جب رنجیتا کے سامنے اس نے شادی کی بات رکھی تو وہ لاکھ کوشش کے بعد بھی انکار نہ کر سکی۔ گھر والوں کی پسند کہیں اور تھی۔ اس کی پسند کہیں اور۔ اپنی پسند کی زندگی جینے کے لئے اس نوجوان کے ساتھ فرار ہونے کے سوا اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

رنجیتا کے چلے جانے کے بعد گھر والوں نے اسے بہت ڈھونڈا۔ بہت انتظار کیا۔ لیکن وہ نہ ملی اور نہ ہی آئی۔ ہاں دو ماہ کے بعد ریڈ کراس ایریا میں ایک لڑکی نے روشن دان کی رسی سے لٹک کر جو خودکشی کی تھی وہ کوئی اور نہیں رنجیتا ہی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نوجوان نے اسے یہاں لا کر اچھی خاصی قیمت پر فروخت کیا تھا۔ وقت کے مختصر سے حصے میں زخموں کی ایک اور نئی دنیا آباد ہو گئی۔!

آج سنیتا کی حرکت سورج سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس لئے وہ بے جان تھا کہ آخر ہوا کیا ہے جو وہ آج اسے چھوڑ کر چھاڑ کر کہیں اور کھوئی ہوئی ہے۔ اس لئے اس نے اس بار اپنی

طرف متوجہ کرنے کے لئے سنیتا کے چہرے کے سامنے اپنے سر کو لا کر دو تین بار زور سے ہلایا۔ پٹ پٹ کی آواز سن کر سنیتا ماضی کے زخموں کو سمیٹ کر حال کی وادی میں چلی آئی۔

تھوڑی دیر بعد جب سنیتا اپنی بے ہنگم سانسوں کو درست کر چکی تب اس کی محبت بھری نظریں سورج کی جانب اٹھ گئیں۔، جن میں کئی سوالات پنہاں تھے۔

"دنیا کا ہر مرد کتا ہوتا تو یہ دنیا۔؟"

اس نے اس سوال کا خود ہی جواب دیا۔

"انسان، انسان ہے، وہ بھلا "کتا" کیسے بن سکتا ہے۔؟"

اور پھر اس کی آنکھوں کے پردے پر تاریکی رقص کرنے لگی۔ اور ہر وہ چیز جو پہلے صاف نظر آیا کرتی تھی۔ دھندلی سی نظر آنے لگی ...... لیکن سنیتا اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اب بھی دیکھ رہی تھی، سورج اس کے قریب تاریکی میں "ریڈیم" کی مانند چمک رہا تھا۔ جس کی روشنی میں اسے اپنا وجود بے حد روشن معلوم ہوا۔

یکایک سنیتا کے ہونٹ کپکپانے لگے اور جسم میں ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی ایک انگڑائی کے ساتھ اٹھی اور دروازے کھڑکی کی چٹخنی اوپر چڑھادی۔ اور دیوانہ وار سورج کو اپنی بانہوں میں بھینچ کر مزے سے پلنگ پہ لڑھک گئی۔

☆☆☆

BABIL KA MINAR

AKHTAR AZAD

ایک افسانہ نگار ابتداء میں خود اپنے ذاتی تجربوں کی بناء پر بہت آسانی سے چند افسانے لکھ ڈالتا ہے ۔ اس لئے کہ ہر آدمی کی زندگی میں کچھ تجربے ایسے ضرور ہوتے ہیں جنہیں اظہار کی منزلوں سے گزارئیے تو افسانے بن جاتے ہیں ۔ لیکن اصل مرحلہ وہاں شروع ہوتا ہے۔ جب ایک فن کار دوسروں کے تجربوں کو اپنے تجربوں میں ڈھالتا ہے اور اپنے بیان کی ہُنرمندی سے ایسی صورت پیدا کرتا ہے کہ پڑھنے والا بھی انھیں اپنی زندگی سمجھ کر سینے سے لگا لے۔ یعنی قاری ایک ہی تجربے کو بھگتنے والا تیسرا آدمی ہوتا ہے۔ سچّے فنکار کی پہچان یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ وہ ایسے تیسرے آدمی کو کس حد تک اپنے اظہار میں شریک کرتاہے۔ اختر آزاد نے اپنی پندرہ سالہ ادبی زندگی میں یہ ہُنر سیکھ لیاہے۔ وہ اپنے تخلیقی سفر کے دوسرے مرحلے میں داخل ہوچکے ہیں۔ دوسروں کی فکرمندیاں اور دکھ درد اب اختر آزاد کے ذاتی تجربوں میں تبدیل ہونے لگے ہیں۔ یہی بہت ہے کہ کھلے دماغ کے قارئین ابْ اس فنکار کی طرف متوجہ ہیں۔

ڈاکٹر منظر کاظمی (مرحوم) کی آخری تحریر

جمشید پور